یادگارِ غالبؔ

یعنی

جناب مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ غالبؔ دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

اُنکی اقسامِ نظم و نثرِ اُردو و فارسی کا انتخاب اور ہر ایک قسم پر جداگانہ ریمارکس

مرتبہ

خاکسار الطاف حسین حالیؔ پانی پتی

سنہ ۱۸۹۷ء

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپی

یادگارِ غالب

یعنی

جنابِ مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ غالب دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

اُنکی اقسامِ نظم و نثر اُردو و فارسی کا انتخاب اور ہر ایک قسم پر جداگانہ ریمارکس

مرتبہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی

۱۸۹۷ء

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپی

حسبِ ضابطہ رجسٹری کرائی گئی

نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خان

جمع کی گئی ہیں ؛ اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہوسکتی ہیں۔ انکو اب زیادہ حالت منتظرہ میں رکھنا منا
میں نے اُن مسودوں کو کھولا اور اُن یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا ؛ مگر اُن کے دیکھ
معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر بھی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی ؛ اور اسکے سوا کچھ اور کتابیں
درکار ہونگی۔ میں نے دِلّی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور اُنھوں نے مہربانی فرماکر
تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات اُنکو معلوم ہوسکے لکھکر میرے پاس بھیجدیے ؛ ا
اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اُسکی تکمیل ہوسکتی تھی مکمل کی گئی۔

مَیں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی ستودہ بالشان واقعہ اُنکی شاعری و انشاپرداز
کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہذا جس قدر واقعات اُنکی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں اُنکو محض
استطرادی سمجھنا چاہیے ؛ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اُس عجیب و غریب ملکہ
لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالے نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا ؛ اور جو کبھی نظم و نثر کے پیر
میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشقبازی اور رندمشربی کے لباس میں،
کبھی تصوّف اور حُبِ اہلبیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ
رکھتا اُسکو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

لٹریری دنیا میں بہت سے صاحب کمال ایسے گذرے ہیں جنکے زمانے میں اُنکی قدر و منزلت کا پ
پورا اندازہ نہیں کیا گیا ؛ مگر آخر کار اُن کا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں ا

---

* یعنی نواب سعید الدین احمد خاں خلف الصدق نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور سید اکبر مرزا و سید مظفر مرزا نبائر
حسام الدین حیدر خاں مرحوم اور میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق ۱۲

جیسا کہ یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا، یا جہانگیر و شاہجہاں، مگر جس قدر اس اخیر دور میں اُنکو مانا گیا اُسکو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیے

بِکے مُفت یہاں ہم زمانے کے ہاتھوں — پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُنکی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف یہی ایک کام نے اُنکی لائف کو دار الخلافہ کے اخیر دور کا ایک مُہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہوگیا ہے؛ اور اردو نظم و نثر پر بھی اُنکا کچھ کم احسان نہیں ہے۔ اس لیے کبھی کبھی مجھکو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور اُنکی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو اُمور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور انبائے زمان کے فہم سے بالاتر نہوں؛ اُنکو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں۔

پچھلے برسوں میں جبکہ میں دِلّی میں مقیم تھا۔ بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لیکر جمع کیا؛ اور جس قدر اُسمیں اُنکے حالات و اخلاق و عادات کا سُراغ ملا اُنکو قلمبند کیا؛ اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں۔ اُنکو بھی ضبطِ تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیب مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اَور کاموں میں مصروف ہوگیا؛ اور کئی برس تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مُٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔

ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور، باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم ضروری کام میں مصروف تھا۔ دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اُس ضروری کام کو اس کے لیے ملتوی کرنا پڑا؛ اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے

ڈھانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا؛ اور جس ہوا میں اُنھوں نے نشو و نما پائی تھی

ٹ گئی.

زمانہ دگرگونہ آئیں نہاد   شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

خصوص مرزا اسد اللہ خاں **غالب** جنکی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ اُنکو بارھویں

صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے.

نے اپنی کتاب "مہر نیمروز" میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ

کے عہد میں **کلیم** شاعر کو سیم و زر میں تولا گیا تھا؛ مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو

ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے." اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رُتبے سے

نہیں ہیں شاید خودستائی اور تعلی پر محمول کرینگے؛ مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اسمیں کچھ بھی مبالغہ نہیں

وہی کہا ہے جو اُنکے زمانے کے اہل نظر اور اہلِ تمیز اُنکی نسبت راے رکھتے تھے.

زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی؛ اُن کا تمام کلام؛ اُردو، فارسی، نظم

مرزا کے جیتے جی اطراف ہندوستان میں پھیلے گیا تھا؛ اُنکے ماننے والے اور مداح و ثنا خواں ملک

ے میں پائے جاتے؛ اُنکے اصنافِ کلام میں سے ایک یہ؛ مدحیہ قصائد پر اُنکو کم و بیش صلے اور خلعت و

بھی ملتے رہے سے ہیں وہ بیان کی جاتیں ت کے موافق اُنکی خاصی قدر کی؛ ریاستِ رامپور

ے احیت ظاہر کی ہی وظیفہ جاری رہا؛ یہ سب کچھ ہوا؛ مگر جب مرزا کے اُس اعلیٰ رتبے کا.

ری و انشا پردازی میں فی الواقع اُنھوں نے حاصل کیا تھا ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ماننا پڑتا ہے

کہ زمانے کی یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرِ زال کی سی قدردانی تھی جو ایک سُوت کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ نہایت کو پہنچ چکا تھا اور اُنکی دولت، عزت اور حکو
ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حُسنِ اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل
جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں
سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود [illegible] فشاں از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ [illegible] د اعظمِ شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلّی جانا ہوا اِس باغ میں [illegible] روع ہو گئی تھ
دلّی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے؛ مگر جو باقی تھے اور جنکے دیکھنے کا مو
رہیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلّی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اُٹھ

ہمعصر امامی ہروی کو اُسپر ترجیح دیتے تھے : مگر کچھ بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ سعدی کا نام اور اُسکا
طرافِ عالم میں منتشر ہوگیا ؛ اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا۔ شکسپیر کے عہد
یک ایکٹر سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی شکسپیر کے ورکس بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں
ابھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں۔

ا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن؟ — ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
وکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است — شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

ہے اس لحاظ سے۔ کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سولزیشن میں روز بروز جذب ہوتا جاتا ہے
سی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اُسکے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی۔
بعینی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آیندہ زمانے میں مقبولِ خاص و عام ہوگی ؛
تو پر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر اُنکی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک
ں ہوے ؛ کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہوجائیں۔
اکو بحیثیت شاعری پبلک سے روشناس کرنے اور اُنکی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر
مدہ طریقہ یہ تھا کہ اُنکے اصنافِ کلام میں سے ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا ، ہر صنف میں جو
را کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں ، جو کلام نقل کیا جاتا اُسکی لفظی و معنوی خوبیاں
، اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں ، شعرا کے جس طبقے میں مرزا کو جگہ دینی چاہیے اُس طبقے کے
کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ، اُنکی غزل سے مرزا کی غزل کو ، قصیدے سے
کو ، اور اسی طرح ہر صنف سے اُسی صنف کو ٹکرایا جاتا ، اور اسطرح مرزا کے پایۂ شاعری اور اُنکے

کلام کی حقیقت سے اہلِ وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گذار تھا
اسی قدر پبلک کے لیے خاصکر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا؛ اگر ہم اس دشوار گذار منزل کے طے کرنے
میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانیوالونکو مزا نہ آیا"
ناچار ہم نے بجاے طریقہ مذکور کے جو حالت موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے
اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لیے سہل تر اور پبلک کے لیے مفید تر معلوم ہوتا ہے
ہمنے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے؛ نظم اردو، نثر اردو، نظم فارسی
اور نثر فارسی۔ اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جداجدا فصلوں میں درج کیا ہے۔ ہر قسم پر اول کچھ
مختصر ریمارکس کیے ہیں۔ پھر اُس قسم کا انتخاب لکھا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں اُنکی جا بجا شرح
بھی کردیگئی ہے۔ اور کہیں کہیں محاسن کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں۔ خاصکر اُن لوگوں کے لئے
فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلّم الثبوت
اُستادوں کے کلام کے ساتھ کرکے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال بہم پہنچایا تھا۔

مذکورۂ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جس قدر بلند اور پاکیزہ خیالات
وہ سب لے لئے گئے ہیں؛ اور جو اُن سے پست درجے کے خیالات تھے وہ چھوڑ دیے گئے ہیں؛ نہ
بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس رسالے کی بساط اور وسعت کے موافق تا بقدور ہر ایک صنف میں سے کم و بیش
کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور اُنکی فہم سے بعید تر نہو؛
اسکے مؤلف کی نظر میں بھی بوجہ من الوجوہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جسکو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کئی فائدے تصور کیے گئے ہیں۔ ایک

جو لوگ شعر کی سمجھ اور اُسکا عمدہ مذاق رکھتے ہیں؛ اُنکو بغیر اِسکے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو۔
مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا مل جائیگا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ
بسبب اِسکے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کردیے گئے ہیں۔ مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل
کرسکیں گے۔ اور دونو طبقوں کو معلوم ہو جائیگا کہ مرزا نے قوتِ تخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا؛
اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اُردو اور فارسی دونو زبانوں میں
ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

الغرض یہ رسالہ دو حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہے؛ پہلے حصّے میں مرزا کی زندگی کے واقعات۔ جہاں تک
کہ معلوم ہو سکے۔ اور اُنکے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے۔ اِنھیں حالات کے ضمن میں اُنکی خاص خاص
خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں، اور اُنکے لطائف و نوادر۔ جن سے مرزا کی طبیعت کا
اصلی جوہر، اور اُنکی ظرافت کی قوّت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے
ہیں۔ دوسرے حصّے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اُردو اور فارسی کا انتخاب؛ اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو،
اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلّم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔
خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور اُن کی طرزِ شاعری و انشاپردازی پر لکھا گیا ہے؛
جسکو ساری کتاب کا لُبِّ لباب سمجھنا چاہیے۔

اگرچہ مرزا کی لائف۔ جیسا کہ ہم آیندہ کسی موقع پر بیان کرینگے۔ اُن فائدوں سے خالی نہیں ہے
جو ایک بائیوگرفی سے حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر اِن فائدوں سے قطع نظر کیجائے تو بھی ایک
اصلی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہو۔ ہماری پژمردہ اور

دل مردہ سوسائٹی کے لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اسکے سوا ہر قوم میں عموماً، اور گری ہوئی قوم میں
خصوصاً، ایسے عالی فطرت انسان شاذونادر پیدا ہوتے ہیں جنکی ذات سے (اگرچہ قوم کو براہ راست
کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچا ہو) لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو
اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، انکے ورکس میں
چھان بین کرنی، اور انکے نوادر افکار سے مستفید ہونا، قوم کے ان فرائض میں سے ہے جن سے
غافل رہنا قوم کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے۔ جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں "حیف
ابنائے روزگار حسن گفتار مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناسائی فرۂ ایزدی نگشتند
و ازیں نمایشہای نغز فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام۔ سرگراں گذشتند۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز کتاب

میرزا اسد اللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ؛ شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو شہر گرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال۔ جیسا کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا ظاہر کیا ہے۔ یہ ہے کہ اُنکے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے؛ اور اُن کا سلسلۂ نسب تورے ابن ریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے، اور تورانیوں کا جاہ و جلال یا بے رخصت ہو گیا؛ تو ایک مدت دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی؛ گر تلوار ابھی ہاتھ سے نہ چھوٹی؛ کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا؛ اور کل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ بارے نس یزر کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بختِ خفتہ نے پھر کروٹ بدلی؛

ور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہوگئی۔ کئی سو برس وہ تمام
و توران و شام و روم (یعنی ایشیائے کوچک) پر حکمراں رہے۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں
سلطنت کا خاتمہ ہوا؛ اور سلجوق کی اولاد جابجا منتشر و پراگندہ ہوگئی۔ انھیں میں سے ترسم خاں
ایک میرزادے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمر
سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔ مرزا مہر نیمروز کے دیباچے میں لکھتے
"از نوالپیاں این قافلہ نیاے من - کہ در کلمرو ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراس وے بود - چوں سے
کہ از بالا بپستی آید از سمرقند بہند آمد" اور درفش کاویانی میں اس طرح لکھا ہے "بالجملہ سلجوقیاں بعد زو
دولت و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النہر پراگندہ شدند۔ از اں جملہ سلطان
ترسم خاں کہ از تخمۂ اویم سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیاے من از سمرقند بہ ہند
مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی؛ اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں
ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے مرزا کے
دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوادیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور
رسالے کی تنخواہ میں مقرر کردیا۔ انکے کئی بیٹے تھے جنمیں سے دو کے نام معلوم ہیں؛ ایک مرزا کے والد
عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا اور دوسرے نصر اللہ بیگ خاں۔ عبداللہ
کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی؛ جو کہ سرکار* میرٹھ کے
معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داما

* سرکار ملک کے اس حصے کو کہتے تھے جو صوبے کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا۔

سسرال میں بسر کی، اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں
بیٹے ہوئے، ایک مرزا اسد اللہ خاں، اور دوسرے میرزا یوسف خاں۔ جو ایام
یں مجنون ہو گئے تھے اور اُسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں۔ جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے۔ اوّل لکھنؤ میں جا کر
آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے، اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہونچے، اور سرکار آصفی
میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی
رہی، اور وہ واپس آگرے میں چلے آئے۔ یہاں آکر اُنھوں نے الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ نے
اُنکو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے اُنھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار
راجہ سے پھر گئے۔ جو فوج اُس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی اُسکے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں
کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اُن کے گولی لگی اور وہیں اُنکا انتقال ہو گیا، اور راج گڑھ میں[1]
دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گانو بسیرِ حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے
دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا، جو ایک مدتِ دراز تک جاری رہا۔ مرزا کے والد کی
وفات کے بعد اُنکے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے اُنکو پرورش کیا۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہو گئی، اور نواب فخر الدولہ احمد بخش
خاں

---

[1] مرزا نے جو قصیدہ راجہ شیو دھیان سنگھ کی مدح میں لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں

اکنوں کہ شصت و سہ سال + دارم بگوش حلقہ ریحان توبت سال + رنگیں سخن ہزار م و دیرینہ خیر خواہ + زبختی نژاد جو چاکر حضور
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار + کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست + مایہ شعنت تفقد پیراں آں دیار + ... بارگاہ

آپ کا نام ہے

لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے؛ تو اُنھوں نے مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کو جن
نواب موصوف کی ہمشیر منسوب تھیں سرکاری فوج میں بعہدۂ رسالداری ملازم کرادیا۔ اُن کی ذات اور
کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا۔ جو نواح [illegible] میں ہیں بحال رہے اُن کے نام پر مقرر
ہوگئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے اُنکے نامزد رہے؛ اور اُنکی وفات کے بعد اُنکے وارثوں
اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرادیں جس میں سے سات سو روپیہ
سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ غدر دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے
سبب یہ پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہوگئی تو پنشن پھر جاری ہوگئی؛ اور تین برس کے
واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔ جب تک پنشن بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا
اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا
تھا؛ اُسکے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو آگیا ہے؛ اس طرف سے
خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا؛ خدا رزاق ہے؛ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے"۔
مرزا نے اپنے علو خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے چونکہ اُن میں سے بعض اشعار لطف
سے خالی نہیں اسلیے اِس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں قطعہ

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے — بسترگان قوم پیوندیم
ایبکیم* از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

* ایبک ترکی لفظ ہے مرکب ایے اور بک سے۔ ایے چاند کو اور بک کامل اور بزرگ کو کہتے ہیں پس ایبک کے معنی ہیں ماہِ کامل۔ اسی لئے مرزا نے کہا ہے "در تمامی ز ماہ دہ چندیم"۔

ن آبای ماکشا ورزیست | مرزبان زادۂ سمرقندیم
ز معنی سخن را | خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را ... تا گزدیم | ... گل را بسینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہمنفسیم | ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم | بمعاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمے گرییم | ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعہ

ساقی! چو من پشنگی و افراسیابیم | دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار | زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

رباعی

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم* | زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر | شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سنِ شعور تک آگرے ہی میں رہے؛ اگرچہ سات برس مگر تلو و دلّی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک اُنکی مستقل سکونت آگرے ہی میں بیٹے کو شیخ معظم جو اُس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اُنکے بعض یہ رسی نژاد جسکا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہُرمُزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے

...پ کا نام ہے ۱۲ * زادشم افراسیاب کے علاوہ اور پشنگ کے باپ کا نام ہے

ڈلیک کے لشکر ہو رہا گیا؛ غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا؛ جوکہ دو برس تک مرزا پاس اوّل
[illegible] اور پھر دلّی میں مقیم رہا؛ میرزا نے اُس سے فار[illegible] کسی قدر بصیرت پیدا کی۔ اگ
کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا ہے کہ [illegible] مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے،
عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھکو لوگ بے اُستاد کہتے تھے اُن کا مُنھ بند کرنے کو میں
ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے،، مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی
اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جابجا اُسکے تلمذ پر اپنی تحریرو
میں فخر کیا ہے اور اُسکو بلفظِ ہمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے۔ لیکن ج
مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے۔ مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے
مکان پر وارد ہوا ہے اور کُل دو برس اُسنے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ
کو کس عمر میں اُسکی صحبت میسرآئی، اور کس قدر قلیل مدت اُسکی صحبت میں گذری؛ تو عبدالصمد ا
اُسکی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اِس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھکو مبدأ فیا
کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

ایک جگہ مرزا نے مبدأ فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے او
شعر یہ ہے

انچہ در مبدأ فیاض بود آنِ من ست — گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں من ست

ایک اور مقام پر اِس سے بھی عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

باخذِ فیض ز مبدأ فزودہ ام از اسلاف — کہ بودہ ام قدرے دیر تر دراں [illegible]

چونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لئے اُنکے خاندان سے
ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا؛ مرزا کی شادی نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں
کے ہاں قرار پائی۔ اور۔ جیسا کہ مرزا نے ایک رقعہ میں اشارہ کیا ہے۔ تیرہ برس کی عمر
رجب ۱۲۲۵ ہجری۔ کو اُن کا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے اُن کی آمد و رفت دلی میں زیادہ
اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلی ہی میں رہے۔

کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھی۔ وہ منشی شیو نرائن
کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے
معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار۔ تمکو ہمارے
اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھ سے سنو! تمھارے پردادا نجف خاں
نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری
بیٹھے، تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے
کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے
اور اُنھوں نے جو کیتھم گانو اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اُس امر
؛ اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہمعمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر
بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر
رہ نہا ہے؛ آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی؛ چونکہ گھر اُن کا بہت دُور
اس حالت میں بس ہمارے اور اُنکے مکان ...

ظہور خسرو و سعدی بہ ششصد و پنجاہ ظہور من بجہان در ہزار و بیست و دو و پست

ملا عبد الصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اُسکی مادری زبان اور اُسکی قوم کی مذہبی زبان
عربی زبان کا بھی - جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے - بہت بڑا فاضل تھا - اگرچہ مرزا کو اُسکی صحبت
کم میسر آئی ، مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغر سن میں ایسے شفیق ، کامل ، اور جامع السنہ
کامل جانا اُن نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں ۔ اگرچہ مرزا کو
زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا ، مگر اُسکے فیضِ صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا
کر دیا تھا جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ " اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابر ست ، و اگر
ہم خواندہ و ناخواندہ برابر " معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی حسنِ قابلیت اور حسنِ استعداد
کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک
نواب مصطفٰے خاں مرحوم کہتے تھے کہ مُلّا کے ایک خط میں جو اُسنے مرزا کو کسی دوسرے ملک
فقرہ لکھا تھا " اے عزیز چہ کسی ؟ کہ باایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطرمے گذری "
ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا اُسمیں ہرگز مضائقہ
اور جیسا کہ قاطع برہان اور درفشِ کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اُس
زبان کے مقدم اصول اور گُر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جنکو فہم
سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور
باتیں مرزا کے دل میں بوجہ احسن نشین کر دی تھیں وہ کہتے ہیں

ع بدامان من ست

باخذ فیض ز مید آفرید ایں زبان اگر دو کے نقدے کے ساتھ ... ودہ ام قدرے دیر تر در آں

بے دو کڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے
کے دروازے کی سنگیں بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اُسکے ایک کھٹیا والی حویلی،
یم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی، اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی، اور اُس سے
ے بڑھکر ایک کٹرا۔ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس
ے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا؛ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں
ے ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیشدست رہتا تھا اور وہ کٹروں کا کرایہ اُگاہکر جمع کرتا تھا۔ بھائی
م سنو تو سہی؛ تمھارا دادا ابت کچھ پیدا کر گیا۔ علاقے مول لیے تھے اور زمینداری اپنا کرلیا تھا۔ دس
بارہ ہزار روپئے کی سرکار کی مالگذاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟
سا حال اندروے تفصیل جلد مجھکو لکھو" اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی
آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جسکی بدولت اُنکے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے
مالگذار بن گئے تھے؛ اور مرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے اللّے تللّوں میں بسر ہوا تھا۔

اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن سے سُنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب
میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی جو
راقم نے پہلی ہی بار اُن کو دیکھا ہے۔ حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت
اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلتِ خوراک اور امراضِ دائمی سے
دہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں
اس حالت میں بھی وہ ایک نودار و نورانی معلوم ہوتے تھے۔

دلی میں اُنکے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اس تمام مدت میں انھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کیے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایہ کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اُکتا یا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اُسکے قریب جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جاکر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جسکی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے ۔۔۔ یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسیطرح مطالعے کے لیے بھی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گذری۔ کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لادیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کردیتے تھے۔

ظاہراً مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے۔ کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اُس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور اُن کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُن کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے۔ جنمیں وہ اور اُنکے بھائی بھی شریک تھے۔ جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروزپور جھرکہ پر محول کردی تھی مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو

عالمِ شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں
سب خرچ ہوگیا؛ لاچار فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروزپور سے
جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اُس قدر ہمکو نہیں ملتی۔ ضرورتوں
نے سخت تنگ کر رکھا تھا؛ اِدھر قرضخواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا؛ اُدھر چھوٹے
بھائی کو جنون ہوگیا؛ مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا؛ اُس کشمکش
میں اُنکو اِسکے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہونچکر سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ
پیش کریں۔ چنانچہ مرزا اُس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "ہنگامۂ دیوانگی برادر یک
طرف، و غوغای وام خواہاں یک سو؛ آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب، و نگاہ روزنۂ چشم فراموش
کرد؛ و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ بابے از سخن دوختہ، و چشمے از خویش فرو بستہ،
بہماں جہاں شکستگی، و عالم عالم خستگی با خود گرفتم؛ و از بیدادِ روزگار نالاں، و سینہ بر دمِ تیغ مالاں،
بکلکتہ رسیدم"

غرضکہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ کلکتے میں
لوگوں نے اُنکی بہت خاطر مدارات کی اور اُن کو کامیابی کی امید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب
...ی گورنمنٹ ہند نے جنکی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ اُنکے کلیات میں موجود ہے؛ وعدہ
...تمھارا حق ضرور تمکو ملے گا۔ کول برک صاحب جو اُس وقت دلّی میں رزیڈنٹ تھے اُنھوں
...دلّی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کرلیا تھا۔ اِن امیدوں کے دھوکے میں
...رے دو برس کلکتے میں رہے؛ مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان میلکم

نقل

قصیدہ ... لکھنؤ

گورنر بمبئی سے - جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے، اور انھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں؛ مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ انھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروزپور سے ملنی قرار پائی تھی اُسکی مفصل کیفیت جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی - گورنمنٹ میں بھیجدی۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انھوں نے ولایت میں اپیل کیا؛ مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں؛ ایک تو یہی کہ انکے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آیندہ پوری ملا کرے۔ دوسری یہ کہ اب تک جس قدر کم پنشن ملتی رہی ہے اُسکی واصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروزپور سے دلوائی جائے۔ چونکہ پہلی درخواست نامنظور ہوئی تھی (اس لیے دوسری درخواست کیونکر منظور ہوتی) تیسری درخواست یہ تھی کہ کُل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے وہ اور شرکا سے علٰحدہ کردیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروزپور سے خزانہ سرکار میں منتقل ہو جائے؛ تا کہ رئیس فیروزپور سے مانگنی نہ پڑے۔ یہ دونو درخواستیں منظور ہوگئیں اور اُنکے موافق اخیر تک عملدرآمد رہا) پانچویں درخواست خطاب و خلعت کی تھی۔ جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا۔ لیکن گورنر جنرل اور لوکل گورنمنٹ سے اُن کو "خانصاحب بسیار مہربان دوستاں" لکھا جاتا تھا۔ اور جب دلی میں ویسرا ے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو اُنکو بھی مثل دیگر رؤسا و عمائدِ شہر [illegible] دیا جاتا تھا۔ اور سات پارچہ کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالاے مروارید کے اُنکو برابر [illegible] ملتا تھا۔ اور تمام لوکل حکام اور افسر اُنسے رئیس زادوں کی طرح ملتے رہے۔

[illegible] جنیر [illegible] کردی [illegible] بھی ہو

کلکتے کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے
اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں
سروئے سوا کسیکو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اہل ہند میں سوا ے
خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں ؛ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے"
ی لیے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے قتیل کا نام سُنکر
لکھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوالی سنگھ فریدآباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان
کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے
قوال پیش کیے۔ اسپر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں
ں بوچھاڑ پڑنے لگی۔ اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتے میں بہت تھے مگر چونکہ مرزا اعتراض اور
خالفت سے بہت جز بز ہوتے تھے۔ انکے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ اُنھوں نے
تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ بادِ مخالف۔ جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ
کی نامہربانی کی شکایت اور اُنکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور
درد انگیز طریقے سے بیاں کیے ہیں۔ لکھی۔ یہاں اُس مثنوی کے کچھ کچھ اشعار مختلف مقامات
سے نقل کیے جاتے ہیں۔

اے تماشائیانِ بزمِ سخن   وے مسیحا دمانِ نادرہ فن
اے گرانمایگانِ عالمِ حرف   خوش نشینانِ ایں بساطِ شگرف

مرزا قتیل نومسلم تھے، اسلام لانے سے پہلے اُن کا نام دلوالی سنگھ تھا اور وہ فریدآباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں اُن کی نہایت قدر ہوئی ۱۲

ای سخن پرورانِ کلکته　　وی زبان آورانِ کلکته

هر یکے صدرِ بزمِ بارسگی　　شمعِ خلوت سرای کارسگی

هر یکے پیش تازِ قافلهٔ　　هر یکے کتخدای مرحلهٔ

ای به شغلِ وکالت آماده　　دادِ غمخواری جهاں داده

ای شگرفانِ عالمِ انصاف　　بشارت رسیده از اطراف

ای سخن را طراز جاں داده　　صفحه را ساز گلستاں داده

عطر بر مغزِ گیتی افشاناں　　پہلوانانِ پہلوی داناں

ای گرامی فنانِ ریخته گو　　نغز دریاکشانِ گوہر جو

ای رئیسانِ ایں سوادِ عظیم　　وی فراہم شده ز ہفت اقلیم

ہمچو من آرمیدهٔ ایں شہر　　بہرِ کاری رسیدهٔ ایں شہر

اسدالله بخت برگشته　　در خم و پیچ عجز سرگشته

گرچه ناخوانده میہمانِ شماست　　بے سخن ریزه چینِ خوانِ شماست

به تظلّم رسیده است اینجا　　بامیدی آرمیده است اینجا

آرمیدن دہید روزی چار　　خسته را به سایهٔ دیوار

کارِ احباب ساختن رسمست　　میہماں را نواختن رسمست

آں رہ و رسمِ کارسازی کو　　شیوهٔ میہماں نوازی کو

کیستم؟ دل شکستهٔ غمزدهٔ　　بیدلے خستهٔ ستم زدهٔ

برق بیطاقتی بجاں زدهٔ | آتشِ غم بجان و مان زدهٔ
از گداز نفس تباب و تبے | در بیابانِ یاس تشنه لبے
خسِ طوفانی محیطِ بلا | سر بسر گرد کاروانِ فنا
دردمندے جگر گداختهٔ | از غمِ دهر زهره باختهٔ
درِ آگاهیے فنا زدهٔ | همه بر خویش پشت پا زدهٔ
چه بلاها کشیده ام آخر | که بدینجا رسیده ام آخر
به سیه روزِ غربتم ببینید | تیره شبهاے وحشتم ببینید
اندهِ دوریے وطن نگرید | غمِ هجرانِ انجمن نگرید
نه همیں نالهٔ و فغاں بلبم | من و جاں آفریں که جاں بلبم
گریه
موبه چوں موے کرده است مرا | غصه بدخوے کرده است مرا
ذوقِ شعر و سخن کجاست مرا | کے زبانِ سخن سراست مرا
دارم آرے ز هرزه لائی خویش | نوحه بر خویش و بینوائیِ خویش
گردشِ روزگارِ خویشتنم | حیرتِ کار و بارِ خویشتنم
با من ایں خشم و کیں!! دریغ دریغ | من چناں تاں چنیں!! دریغ دریغ
بر غریباں کجا رواست ستم | رحم اگر نیست خود چراست ستم

بنده ام بندهٔ مهربانان را | رمز فهمان و نکته دانان را

نه ز آویزشش بیاں ترسم　　من و ایمان من گراں ترسم

که پس از من بسا لہائے دراز　　بزباں ماند ایں حکایت باز

که سفیہے رسیدہ بود ایں جا　　چند روز آرمیدہ بود ایں جا

با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت　　زحمتے داد و راہِ خویش گرفت

شوخ چشمے و زشت خوئے بود　　بیحیائے و ہرزہ گوئے بود

ہم سفیہانہ گفتگوئے داشت　　ہم خراباتیانہ ہوئے داشت

برگِ دنیا نہ سازِ دینش بود　　ننگ دہلی و سرزمینش بود

آہ ازاں دم که بعد رفتنِ من　　خون دہلی بود بگردن من

تا بوم رنجِ دوستاں باشم　　بر دلِ انجمن گراں باشم

شاد گردند کز میاں بروم　　آوخ از من که من چناں بروم

خستہ و مستمند برگردم　　دژم آیم نژند برگردم

بود اعم کس از شما نرسد　　شوق را خردہ و فا نرسد

دوستاں را اگر ز من گلہ است　　که خرامت خلاف قافلہ است

می رویم از پے قتیل ہمہ　　ساختہ مرور اولیل ہمہ

تو ازیں حلقہ چوں بدر زدہ　　گام بر جادہ دگر زدہ "

اے تماشائیان ژرف نگاہ　　ہاں بگوئید حسبۃً للہ

کہ جہاں از غزلی بہ پیچم سر؟ — آں کہ جادو دمی بہ ہر سطر

دل* دہد کز اسیر برگردم؟ — زاں نوائیں صفیر برگردم

دامن از کف کنم چگونہ رہا — طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح و روانِ معنی را — آں ظہوری جہانِ معنی را

آنکہ از سر فرازیِ قلمش — آسماں ساست پرچمِ علمش

طرزِ اندیشہ آفریدۂ اوست — در تنِ لفظ جاں دمیدۂ اوست

پشتِ معنی قوی ز پہلویش — خامہ را فربہی ز بازویش

طرزِ تحریر را نوی از وے — صفحہ ارتنگِ مانوی از وے

فتنۂ گفتگوے اینانم — مستِ لاے سبوے اینانم

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد قتیل و واقف را

لیک با اینہمہ کہ ایں دارم — گنجِ معنی در آستیں دارم

دل و جانم فداے احبابست — شوق وقفِ رضاے احبابست

میشوم خویش را بہ صلح دلیل — می سرایم نواے مدحِ قتیل

تا نماند ز من دگر گلۂ — رسد از پیروانِ وے صلۂ

گفتن آئین ہوشیاری نیست — لیک دانستن اختیاری نیست

گرچہ ایرانیش نخواہم گفت — سعدیِ ثانیش نخواہم گفت

---

* یعنی آیا دل اجازت دیتا ہے کہ از اسیر برگردم۔ یہ اہل زبان کا محاورہ ہے کہ دل دہد بجائے "دل دستوری دہد" کے بولتے ہیں۔

لیک از من ہزار بار بہ است — از من و ہیچو من ہزار بہ است

من کفِ خاک و او سپہرِ بلند — خاک را کے رسد بچرخ کمند

وصفِ او حدِ چون منے نبود — مہر در خوردِ روزنے نبود

مرحبا سازِ خوشش بیانی او — حبذا شورِ نکتہ دانی او

نظمش آبِ حیات را ماند — در روانی فرات را ماند

نثرِ او نقشِ بالِ طاؤس ست — انتخابِ صراح و قاموس ست

پادشاہے کہ در قلمرو حرف — کردہ ایجاد نکتہ ہاے شگرف

خامہ ہندوی پارسی دانش — ہندیاں سر بخطِ فرمانش

ایں رقمہا کہ ریخت کلکِ خیال — بود سطرے ز نامۂ اعمال

از منِ نارسائے ہیچمداں — معذرت نامۂ ایست نزدِ یاراں

بو کہ آید ز عذر خواہیِ ما — رحم بر ما و بیگناہیِ ما

آشتی نامہ و وداد پیام — ختم شد والسلام والاکرام

ورود لکھنؤ

جب مرزا نے دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اُسوقت راہ میں ٹھیرنے کا قصد نہ تھا۔ مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں؛ اس لیے کانپور پہنچ کر اُنکو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ اُس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہلِ لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شایستہ

انکی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہوسکا؛ مگر ایک
مدحیہ نثر صنعتِ تعطیل میں - جو اُنکے مسودات میں موجود ہے - نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے
لئے لکھی تھی۔ لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں؛
ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جاے۔ اسی وجہ سے مرزا -
بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں - وہاں سے کلکتے کو روانہ ہوگئے۔ مگر
معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ دلّی سے نصیر الدین حیدر
کی شان میں لکھکر ایک دوست کے توسط سے گذرانا تھا۔ اور اُسپر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے
ملنے کا حکم ہوا تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے؛ تین ہزار روشن الدولہ
کھا گئے؛ اور دو ہزار متوسط کو دیکر کہا کہ اسمیں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو۔ مرزا صاحب نے
یہ سُنکر پھر کچھ تحریک کی۔ مگر تین دن بعد یہ خبر پہونچی کہ نصیر الدین مر گئے۔ پھر واجد علیشاہ
کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی؛ اور پانسو روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے مقرر
ہوگئے۔ لیکن صرف دو برس گذرے تھے کہ ریاست ضبط ہوگئی؛ اور وہ دفتر گاؤ خورد ہوگیا۔

لطیفہ

لکھنؤ کی ایک صحبت میں - جب کہ مرزا وہاں موجود تھے - ایک روز لکھنؤ اور دلّی کی زبان پر گفتگو
ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں
اہلِ لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں؛ آپ کی راے میں فصیح آپکو ہے یا اپنے تئیں؟ مرزا نے کہا
فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں؛ مگر اسمیں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت
یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں، اور میں اُسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض

کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں؛ تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہونگا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سُنکر پھڑک گئے۔ مرزا کا مطلب صرف اِس قدر بیان کرنا تھا کہ آپ کو مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے؛ اگر متکلم کے لئے بھی اِسکا استعمال ہوگا تو بعض مواقع پر التباس واقع ہوگا۔ اِس مطلب کو اُنھوں نے اِس لطیف پیرایے میں بیان کیا۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہلِ صحبت کے خوش کرنے کے لئے تھا۔ ورنہ اہلِ دہلی بھی اکثر بجاے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں؛ اِسمیں کچھ اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

لطیفہ

زبان کے متعلق مرزا کا اِسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دلّی میں رتھ کو بعضے مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مؤنث ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں۔ جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند۔ جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہوگئے تھے۔ مدرسین کے امتحان کے لئے دلّی میں آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے؛ اِسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہوکر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی؛ انھوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی

سے اُتر کر اِس انتظار میں ٹھیرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری اُنکے لینے کو آئینگے
جب بہت دیر ہوگئی، اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اِس سبب سے نہیں آئے؛ وہ خود باہر چلے آئے
اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں تشریف لاوینگے تو آپ کا اُسی طرح استقبال کیا جائیگا
لیکن اسوقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اِس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے
کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اِس لئے کہ موجودہ اعزاز
میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجکو اِس
خدمت سے معاف رکھا جائے؛ اور یہ کہکر چلے آئے۔

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ
بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اِسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۳ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گذرا۔
مرزا نے خود اس واقعہ کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر
لکھتے ہیں "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف؛ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ
مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے؛ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر
کردیا۔ سشن جج۔ باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھسے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور
اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اُسنے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا
مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ
کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی
رپورٹ بھیجنے پر اُسکی بہت تعریف کی۔ سُنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور

میری خاکساری اور آزادہ روی سے اُسکو مطلع کیا؛ یہاں تک کہ اُسنے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی۔ اگرچہ میں۔ اِس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاسکتا۔ جو کچھ گذر ا اُسکے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اُسپر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں؛ اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے؛ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جاے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئیگا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اِسکے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھپر گذرا اور یہ ہے جسکا میں آرزومند ہوں"

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گذرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اُنکو قید خانے میں گذرے اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی؛ وہ بالکل قید خانے میں اُسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسبِ دلخواہ گھر سے اُنکو پہونچتی تھیں۔ اُنکے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے۔ اور وہ صرف بطور نظربندوں کے جیلخانے کے ایک علحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ مگر چونکہ اُسوقت تک شہر کے شرفا و اعیاں کے ساتھ کبھی اِس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اِس لیے وہ اسکو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو ترکیب بند اُنھوں نے قید خانے میں لکھا تھا اُسمیں کہتے ہیں

رانده دانا غم رسوائی جاوید بلاست | بہرِ آزار غمم از قیدِ فرنگم نبود
جور بر اعدا رود از ذل بہ رہائی۔ لیکن | طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نبود

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے اُس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا۔ اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر اُن کی غمخواری اور ہر طرح کی خبرگیری میں معروف رہے۔ چنانچہ اُسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں۔

خود چرا خوں خورم از غم کہ بغمخواری من — رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں۔ کہ دریں واقعہ غمخوارِ منست
گر بمیرم چہ غم از مرگ۔ عزادارِ منست

جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے + صاحب کے مکان میں آکر رہتے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے؛ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا نے کہا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسب حال لکھ کر دوستوں کو بھیجا تھا۔ اِس نظم میں کل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ شعر ہیں۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیاتِ فارسی میں اِس نظم کو چھپنے نہیں دیا تھا؛ مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک مجموعہ موسوم بہ سبد چین شائع کیا تھا؛ اُس میں اِس ترکیب بند کو بھی شامل کر دیا تھا۔ لیکن سبد چین کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی؛ اِس لئے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا ہے۔ چونکہ

+ حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے پیر اور مولانا فخر الدین قدس سرہٗ کے پوتے تھے مرزا مدت تک اِن کے مکان میں رہے ہیں وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور اُنہیں کی تقریب سے قلعے میں تعلق پیدا ہوا تھا ۱۲

یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالیہ نظموں میں سے ہے اسواسطے اُسکے مختلف بندوں میں سے کچھ کچھ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

از بند اول

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم / غم دل پردہ دری کرد۔ فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب / خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم / چوں نویسم غزل اندیشہ ز غمّاز کنم
یارِ دیرینہ! قدم رنجہ مفرما کاینجا / آں نہ گنجد کہ تو در کوی وطن باز کنم
اہلِ زنداں لب و چشمِ خودم جا دادند / تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
ہلہ دزدانِ گرفتار! وفا نیست بشہر / خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

از بند دوم

پاسباناں بہم آئید کہ من مے آیم / درِ زنداں بکشائید کہ من مے آیم
ہر کہ دیدے بہ رہِ خویش سپاسم گفتے / خیر مقدم بسرائید کہ من مے آیم
جادہ نشناسم و ز انبوہِ شما می ترسم / راہم از دور نمائید کہ من مے آیم
رہرو جادۂ تسلیم درشتی نکند / سخت گیرندہ چرائید کہ من مے آیم
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید / بخت خود را بستائید کہ من مے آیم
تا بہ دروازۂ زنداں پئے آوردنِ من / قدمے رنجہ نمائید کہ من مے آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من ست / بہرہ از من بربائید کہ من مے آیم

از بند چہارم

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی / آفتاب از جہتِ قبلہ برآمد گوئی
دل و دستے کہ مرا بود فروماند ز کار / شب و روزیکہ مرا بود سرآمد گوئی

بہرۂ اہل جہاں چوں زجہاں درد و غم ست | بہرۂ من زجہاں بیشتر آمد گوئی
خستن و بستن من حد کس نیست - برو | بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی
ہنرم را نتواں کرد بخستن ضائع | خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی
چرخ یک مرد گرانمایہ بزنداں خواہد | یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

ہمدماں! در دلم از دیدہ نہانید ہمہ | غالب غمزدہ را روح و روانید ہمہ
للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ | للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ
من بجوں خفتہ و بینم ہمہ بینید ہمہ | من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ
درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بودست | من بریم کہ ہر آئینہ برآئید ہمہ
روزے از مہر نگفتید فلانی چوں ست | بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ
چارہ گر نتواں کرد دعائے کافی ست | دل اگر نیست خداوند دلانید ہمہ
ہفت بند ست کہ در بند رقم ساختہ ام | بنویسید و بہ بینید و بخوانید ہمہ

آں نباشم کہ بہر بزم ز من یاد آرید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

سنہ ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے - دربار عام میں مرحمت اور خاندان تیموری کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا۔ اور یہ قرار پایا ترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کرکے مرزا کے حوالہ کیا کریں؛

اور مرزا اُن تمام مطالب کو اپنی طرزِ خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔ اور کتاب دُو حصّوں پر تقسیم کی جائے۔ پہلے حصّے میں کچھ مختصر حال ابتداے آفرینش سے صاحبقراں تیمور گورکان تک، اور کسی قدر مفصّل حالات تیمور سے نصیرالدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک بیان کئے جائیں۔ اور دوسرے حصّے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کئے جائیں۔ مرزا نے تمام کتاب کا نام پرتوستان اور اُسکے پہلے حصّے کا نام مہرِ نیمروز اور دوسرے حصّے کا نام ماہِ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ اُن کو اپنی دُو ترکیبوں پر ناز تھا؛ ایک ماہِ نیم ماہ اور دوسرے رستخیزِ بیجا[†]۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہِ چہاردہ اور ماہِ دو ہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے؛ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ماہِ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا۔ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرا حصّہ یعنی ماہِ نیم ماہ۔ بالکل نہیں لکھا گیا۔ مہرِ نیمروز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لئے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصّہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہوگیا اور اُس حصّے کا صرف نام ہی نام رہگیا۔

حیدرآباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہِ نیم ماہ کو طلب کیا تھا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "ماہِ نیم ماہ اسمیست کہ مسمّی ندارد۔ چوں از سرنوشت گردن نتواں پیچید سرگذشت باز گویم ہرگاہ یک نیمہ از پرتوستان انجام یافت، و مہرِ نیمروز نام یافت، لختے درنگ ورزیدہ شد؛ تا نفس راست کردہ آید۔ ناگاہ کارفرما روز فرو رفت، و روزگار بسر آمد؛ و دولت دیرینۂ ترکمانانِ قراچاریہ سپری گشت۔ ماہِ نیم ماہ چجور

---

† رستخیزِ بیجا غدر کی تاریخ کا مادہ ہے۔ اس میں رستخیز کے اعداد یعنی ۱۲۷۰ میں سے جا کے عدد یعنی (۴) کا تخرجہ کیا ہے"

ماہ بست وہشت شنبہ ناپدیدار، ونامش بعنوانِ بے نشانی در مہرِ نیم روز آشکار - ماند''

سنہ ۱۲۷۱ ہجری میں - جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا - بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہوگئی تھی ۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے ۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوانِ عام میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں ۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ ؛ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ ۔ وہ فوراً لے آیا ۔ مرزا نے جو اُسکو کھولا تو اُسمیں سے آٹھ نو پرچے - جن پر ایک ایک دو دو مصرع لکھا ہوا تھا ؛ نکالے ۔ اور اُسی وقت دوات قلم منگوا کر اُن مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں ؛ اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام وکمال لکھکر چوبدار کے حوالے کیں ۔ ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں اُن کو اِس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشاق اُستاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کردے جب چوبدار غزلیں لیکر چلا گیا تو مجھسے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے آج مدت کے بعد سبکدوشی ہوئی ہے اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرزِ خاص میں لکھتے تھے - نظم ہو یا نثر - اُسکو بڑی کاوش اور جانکاہی سے سرانجام کرتے تھے ؛ چنانچہ خود اُنھوں نے جابجا اسکی تصریح کی ہے ؛ مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت ہوتی تھی اُس وقت اُن کو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا ۔

سنہ ۱۸۷۱ع میں - جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے - مولوی محمد عالم مرحوم نے - جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے - نواب صاحب سے بیان کیا کہ - جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے - ایک مجلس میں - جہاں مرزا بھی موجود تھے ، اور میں بھی حاضر تھا - شعرا کا ذکر

ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا "فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے"۔ اسپر بات بڑھی۔ اُس شخص نے کہا فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا۔ اُسنے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہکر پڑھا تھا۔ مرزا بولے "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ ڈو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہتہ کہہ سکتے ہیں"۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کرکے پڑھ دیا۔ جو کہ اُنکے دیوان ریختہ میں موجود ہے۔ اور جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی　　　زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہیے

اولاد

مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے: مگر کوئی زندہ نہیں رہا اس لئے ایک مدت سے وہ اور اُنکی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غدر سے چند سال پہلے جبکہ اُنکی بی بی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوگیا، اور اُنکے دو نو بچے ایک باقر علیخاں اور دوسرے حسین علیخاں صغیر سن رہگئے۔ تو مرزا اور اُنکی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علیخاں کو جو اُس وقت بہت کم عمر تھا اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا حسین علیخاں کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھکر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ ناز برداری کرتے تھے۔

جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو حسین علیخاں کے بڑے بھائی باقر علیخاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونو خوش فکر اور اہل اور نیک اور نہایت شریف مزاج تھے

مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہو گئے ۔

زین العابدین خاں عارف سے مرزا صاحب کو غایت درجے کا تعلق تھا ۔ کچھ تو قرابت کے سبب ، اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے ، اور باوجود پُرگوئی کے نہایت خوش گو تھے ۔ اُنکو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ۔ اسی لئے جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو مرزا اور اُنکی بی بی پر سخت حادثہ گذرا ۔ مرزا نے اُنکے مرنے پر ایک غزل بطور نوحہ کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے ۔ چنانچہ اُسکے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں ۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں ؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے — کیا خوب ! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھسے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش ؟ — کرنا تھا جواں مرگ ! گذارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب ! — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے ۔ جونہیں بغاوت کا فتنہ اُٹھا اُنھوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا ، اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے ۔

اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراج پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور اُنکے ہمسایوں کے مکان پر۔ جسمیں ایک مرزا بھی تھے۔ حفاظت کے لئے پہرہ بیٹھ گیا تھا؛ اس لئے وہ فتحمند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے؛ مگر پھر بھی اُنکو طرح طرح کی کلفتیں اُٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہوگئے تھے، اور اخیر دم تک اسی حالت میں رہے؛ جب مرزا نے دلی میں سکونت اختیار کی تو اُنکو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے اُنکا مکان تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز۔ کہ دونو عمر رسیدہ تھے۔ اُنکے پاس رہتے تھے۔ جب دلی فتح ہوگئی، اور شہر اہل دہلی سے خالی ہوگیا، اور رستے بند ہوگئے؛ اُس وقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے، اور جو کچھ اسباب ملا۔ لے گئے۔ پھر ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہکر آج آدھی رات گذرے مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت نہ کفن کے لئے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا؛ نہ غسال اور گورکن کا کہیں پتا تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا؛ مگر مرزا کے ہمسایوں نے اُنکی بڑی مدد کی۔ پٹیالہ کی فوج کے ایک سپاہی کو۔ جو حفاظت کے لئے تعینات تھا۔ اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا؛ اور مرزا صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لیکر مرزا یوسف کے مکان پر پہونچے۔ اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے مسجد کے صحن میں۔ جو مکان کے قریب تھی۔ دفن کر دیا۔ مرزا نے دستنبو میں اس مقام پر یہ اشعار لکھے ہیں۔

دریغ آں کہ اندر وزنگ* سہ بیست — سہ دہ شاد وسی سال ناشاد زیست

بجز خاک بالیں نخستش نہ بود — بجز خاک در سر نوشتش نہ بود

خدایا بریں مردہ بخشائشے — کہ نادیدہ در زیست آسائشے

سر وشے بہ لجوئے او فرست — روانش بجا و یدمینو فرست

اور بھائی کے مرنے کی تاریخ اِس طرح لکھی ہے،

زسال مرگ ستمدیدہ میرزا یوسف — کہ زیستے بجہاں در۔ زخویش بیگانہ

یکے در انجمن از من ہمے بچو رہش کرد — کشیدم آہے وگفتم دریغ دیوانہ

اسمیں لفظ آہے کا تخرجہ دریغ دیوانہ میں سے کیا ہے ۔

ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے ۔ راجہ کے سپاہیوں نے ہر چند روکا مگر اُنھوں نے کچھ التفات نہیں کیا ۔ مرزا دستنبو میں لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا ؛ مگر مجھے ، اور دونو بچوں کو ، اور دو تین نوکروں کو ، مع چند ہمسایوں کے کرنل برون کے روبرو۔ جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے ۔ لیگئے ۔ کرنل برون نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا اور ہکر رخصت کر دیا۔ سُنا ہے کہ مرزا جب کرنل برون کے روبرو گئے تو اُسوقت کلاہ پاپاخ اُنکے سر پر تھی ۔ اُنھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھکر پوچھا کہ وَل تم مسلمان ؟ مرزا نے کہا آدھا ۔ کرنیل نے کہا اِسکا کیا مطلب ؟ مرزا نے کہا " شراب پیتا ہوں ؛ سُوَر نہیں کھاتا " کرنیل یہ سُنکر ہنسنے لگا ۔ پھر مرزا نے وزیر ہند

---

* سہ بیست یعنی ساٹھ ۔ دوسرے مصرع میں سہ دہ سے مراد تیس ہے ۱۲

کی چٹھی - جو ملکۂ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی - دکھائی - کرنیل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے ؟ مرزا نے کہا "میں چار کہاروں کا افسر تھا؛ وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے ؛ میں کیونکر حاضر ہوتا ؟ کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور اُنکے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

اس مقام پر مرزا اپنی کتاب دستنبو میں لکھتے ہیں کہ "سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے ۔ میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش و ملت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں - میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرنچ✝ کے سوا کچھ کھاتا پیتا تھا؛ اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھکو نیند نہ آتی تھی ۔ اگرچہ جوانمرد، خدا دوست، خداشناس، دریادل مہیش داس ہندوستانی شراب - جو رنگ میں فرنچ سے مشابہ، اور بو میں اُس سے بہتر تھی - مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جاں بر نہ ہوتا ۔ اسکے بعد یہ رباعی لکھی ہے

رباعی

از دیر دلم وا یہ زہر در می جست | از بادۂ ناب یک دو ساغر می جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بمن | آبے کہ برائے خود سکندر می جست

چونکہ اُس وقت مسلمانوں سے شہر خالی ہوگیا تھا مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا - جو اُنکے پاس برابر آتے رہتے تھے، اور ہر طرح سے اُنکی غمخواری کرتے تھے - کوئی اُن کا غمخوار نہیں رہا تھا ۔ مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے ؛ سرکاری پنشن، اور قلعے کی تنخواہ ؛ سو یہ دونو ذریعے مسدود

✝ فرنچ ۔۔ جو فرانس سے منسوب ہے اور یہاں اُس سے فرانس کی شراب مراد ہے ۔۔

ہو گئے تھے۔ شہر کے تمام مسلمان عمائد۔ جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے۔ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔ اسکے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا کوئی اور قیمتی چیز تھی؛ جب شہر لٹنے لگا۔ تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لئے بھیج دیا؛ جہاں سے فتحمند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے اس تنگی و عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا، اور جو حالت اُنپر اور اُنکے متعلقین پر خوش و ناخوش گذری اُسمیں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار ناچار اُنکی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ "اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا، اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا"، اسکے بعد کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ "اس بازیچۂ اطفال۔ یعنی کتاب دستنبو۔ کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کیجائے؛ جو حالت کہ اس وقت درپیش ہے ظاہر ہے؛ کہ اُسکا انجام یا موت ہے، یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے، اور دوسری صورت میں نتیجہ اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؛ کہ کسی دکان سے دھتکارے گئے، اور کسی دروازے سے کوڑی پیسا کچھ مل گیا۔ پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب اُسمیں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ملی تو تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونو صورتوں میں۔ چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔ ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جا کر بسر کرنا پڑیگا"

غدر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا۔ مگر دو برس بعد نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رامپور

نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے مرزا کے واسطے مقرر کردیا۔ جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا۔ اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے سرکاری نپنشن بھی جاری ہوگئی۔

لطیفہ

جب نواب یوسف علیخاں کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لئے رام پور گئے چند روز بعد نواب کلب علیخاں مرحوم کا نواب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا آنکی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے چلتے وقت نوابصاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا حضرت. خدا نے تو مجھے آپکے سپرد کیا ہے آپ پھر اُلٹا مجکو خدا کے سپرد کرتے ہیں"

قاطع برہان

جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے، اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا؛ اُس وقت سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں، اور کچھ لکھ پڑھکر اپنا غم غلط کریں. اور دل بہلائیں مرزا پاس اُس وقت سوائے برہانِ قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی. برہان کو اُٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا. پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں. پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی. ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا. شعرا نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کئے ہیں اُن کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا. طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصولِ لغت نگاری کے خلاف پایا. بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جسکے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے. مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابلِ اعتراض نظر آئے اُنکو ضبط کرنا شروع کیا. شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی۔ جسکا نام قاطع برہان رکھا گیا، اور سنہ ۱۸۶۲ء میں چھپ کر شائع ہوگئی. پھر مرزا نے سنہ ۱۸۶۵ء میں باضافۂ دیگر مضامین و فوائد اُسکو دوسری بار چھپوایا اور اُسکا

تام درفشِ کاویانی رکھا۔

یہاں دو چار مثالیں اُن الفاظ کی درج مناسب معلوم ہوتی ہیں جن پر مرزا نے صاحبِ برہان کا تخلیہ کیا ہے۔ مثلاً صاحب برہان نے عنبرارزاں کے معنی گیسوے رسول مقبول کے لکھے ہیں ؛ اور یہ کہتا ہے کہ اُسکو عنبرلرزاں بھی کہتے ہیں۔ مرزا۔ صاحبِ برہان کی غلطی کا منشا یہ بتلاتے ہیں کہ اُسنے نظامی کا یہ شعر دیکھا ہے جو نعت میں ہے "بوے کزاں عنبرلرزاں دہی ✣ گرد دو عالم وہی ارزاں وہی ✣ پس عنبرلرزاں میں اِستعارہ کو اصلی لغت قرار دیا اور دوسرے مصرع میں ارزاں کے موقع اور محل کو بالکل نہیں سمجھا اور آنحضرتؐ کی زلفِ عنبربو جو دو نو جہان کے بدلے میں بھی ارزاں ہو اُسکا نام عنبرارزاں رکھدیا یا مثلاً برہان میں لکھا ہے "قافلہ شد بمعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت کہ کنایہ از فوت شدن پیغمبر باشد" اوّل تو قافلہ شد کو ایک لغت قرار دینا ہی بے معنی ہے پھر اُسکے معنی قافلہ سالار رفت کہنا اور قافلہ سالار کے جانے سے وفات سرورِ کائنات مراد لینا غلط در غلط اور خبط در خبط ہے مرزا غلطی کا منشا مولانا نظامی کے اِس شعر کو بتاتے ہیں "قافلہ شد واپسیِ ما ببیں ✣ اے کسِ ما بیکسیِ ما ببیں ✣ یہ شعر مخزنِ اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے مگر مرزا نے سہو سے اسکو جامی کی طرف منسوب کیا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور ساتھی سب چل دیے اب تیرے سوا کوئی ہمارا یار و مددگار نہیں ہے یا مثلاً صاحب برہاں لکھتا ہے کہ "شش ضرب نتیجہ خوب کنایہ از گوہر و زر باشد و کنایہ از شکر و کنایہ از شکر و عسل و اقسام میوہ ہا ہم ہست و بحذف ضرب ہم بنظر آمدہ کہ شش نتیجہ خوب باشد،" مرزا نے جو اسکا خاکا اُڑایا ہے وہ طول طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس مرکب اور بے معنی جملے کو لغت قرار دینا صاحب برہان ہی کا کام ہے اور اِس طرح کے صدہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے گرفت کی ہے اور طرح طرح کی

لغزشیں اور بے ربطیاں ہیں جو بغیر اسکے کہ درفشِ کاویانی کو اوّل سے آخر تک دیکھا جائے ذہن نشین نہیں ہوسکتیں۔

جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اُس وقت اُنکے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی، اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ جو کچھ اُنھوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا۔ بااینہمہ چند مقامات کے سوا۔ جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے، اور بعض غلطیوں کا اُنھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے۔ اُنکے تمام ایراد واجبی معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ درفشِ کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلاے کلکتہ کی مصحح و مطبوعہ برہان مرزا کے پیشِ نظر تھی۔

قاطع برہان کی مخالفت

اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا۔ ایک قاطع برہان کے جواب میں مُحرقِ قاطع، قاطعِ قاطع، مؤیدِ برہان، ساطعِ برہان وغیرہ چند رسالے لکھے گئے۔

مخالفت کی وجہ

مخالفت کی وجہ ظاہر ہے۔ تقلید نہ صرف امورِ مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم، اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہوگئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے؛ اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سَو دوسَو برس پہلے لکھی جاچکی ہے وہ وحی مُنزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات برہانِ قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے؛ ممکن نہ تھا کہ اُنکی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کیجاتی۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہ شوخیِ طبع کے صاحب برہان کا جابجا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظِ ناملائم بھی غیظ و غضب میں اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں زیادہ تر اس وجہ سے

مخالفت ہوئی، مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا۔ صاحب برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ۔ جو آج کل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں۔ اُنکے لئے کنجِ خمول وگمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اسکے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔

جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے ہیں جب اُن کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب بہت صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک مجیب برہان کی تائید اِسطرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحبِ برہان نے لغت کی تحقیق کی ہے؛ اِسی طرح فرہنگ جہانگیری، یا فرہنگ رشیدی، یا سراج اللغات، یا مؤید الفضلاء، یا ہفت قلزم، یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے۔ اور اِس سے بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اُسیکا تتبع کیا ہے؛ تو کسی مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے ۱۲۸۸ھ میں یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ جو فرہنگِ ناصری کے نام سے موسوم ہے، اور مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغات کے متعلق جو کچھ اُسنے لکھا ہے وہ بہرحال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے۔ جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھکر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں۔ زیادہ معتبر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اُسنے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، اور برہانِ قاطع،

تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور اُسکے بعد ایک باب میں صرف
برہانِ قاطع کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے ایک پہاڑ کے اوپر، یا
غرناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا، یا چکاک کے تین معنی لکھے ہیں، پیشانی، قبالہ نویس،
اور مہرکن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ہیں) یا کروخ جو ایک قریہ ہے مضافات ہرات میں اُسکو
برہان میں لکھا ہے۔ قریہ ایست از قرائے عالم۔ یہاں ازراہِ طنز صاحب فرہنگِ ناصری لکھتا
ہے "فی الحقیقت تحقیقے وتیق فرمودہ است" اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحب برہان کی اِس
باب میں ظاہر کی ہیں۔ اور اِسکے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جا بجا اُسکا تخلیہ کیا ہے۔

جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے ہیں، اُنکی بھی جا بجا فرہنگِ ناصری سے تائید ہوتی
ہے۔ انماں جملہ لفظ آجیں، استخر و اصطخر، جمدر، باختر، راوش و زاوش، کار کیا،
ویژہ وا ویژہ، اور اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگِ ناصری میں مرزا کے
بیان کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اِسکے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بے معنی اور مہمل
بتایا ہے؛ رضا قلی خاں بھی اُسکو مہمل بتاتا ہے۔ مثلاً لفظ انجلک کی تفسیر میں صاحب برہان
لکھتا ہے "ہر چند فراشِ خیال جاروب سنبل بر جل خرسک ریش زند از پوست آں پاک تواند"
مرزا اِسکی نسبت لکھتے ہیں "فقرۂ اخیر مگر کلامِ دیوست ؟ ہر گاہ خوبیِ تحقیق چناں و حسنِ عبارت
چنیں باشد مقصودِ اصلی کہ معلوم کردنِ مجہولاتست از برہانِ قاطع چگونہ حاصل تواں کرد" رضا قلی
اور اوطنز اسی فقرے پر یہ لکھتا ہے "دریں مقام ایں انشاے بدیع و بیانِ بلیغ زادۂ طبعِ لطیف ایشاں
بودہ۔ برہانِ ذوقِ سلیم و سلیقۂ مستقیم صاحبِ برہاں خود ہمیں عبارات بس است۔ تا از ین سیں

ازو چہ آید" اِسی طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کرکے اُسپر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ "در ولایتِ ہند
کہ نہ ترکی دانند و نہ پارسی ضبط و تصحیحِ لغاتِ فارسی کے توانند" ایک جگہ صاحب برہان جامع (جو کہ ایرانی ہے)
کا قول برہانِ قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "برہانِ قاطع میں لغات بغیر سند اور
شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں؛ اُنپر اعتبار نکرنا چاہیے۔ اسمیں کنایات کو بھی علحدہ لغت قرار دیتا ہے،
اور سریانی و عبرانی و ترکی و ژند و پاژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان میں، اور ایک ایک لغت کو بار
بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں؛ تطویلِ لاطائل کرتا ہے" اسکے بعد رضا قلی۔ صاحبِ برہان
جامع کی تصدیق، اور اُسکے ساتھ اتفاق رائے، کرتا ہے۔ چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان بے مزہ
معلوم ہوگا اس لئے ہم اِس سے قطع نظر کرتے ہیں جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ فرہنگِ ناصری
کو خود ملاحظہ کرے۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کئے ہیں؛ خصوصاً لفظِ افسوس کے متعلق
ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے۔ کہ اُسکو لفظ عربی الاصل ماخوذ از اسف قرار دیا ہے۔ اور اِس غلطی کا
اُنھوں نے آخر کار خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے،
اور ممکن ہے کہ اِسکے سوا اور بھی کہیں کہیں اُن سے غلطی ہوئی ہو؛ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے
تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتیِ طبع اور ذوقِ صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور۔ جیسا کہ
وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "فارسی زبا[illegible]ے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اِس طرح جاگزیں ہیں
جیسے فولاد میں جوہر" فی الواقع فارسی [illegible] سے اُن کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جو رائے
اُنھوں نے محض اپنے وجدانِ سلیم کی [illegible] سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے

محققوں نے اُنکی نسبت ظاہر کی ہے ، اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزا نے برہان میں بتائی ہیں۔ اور اُنکے سوا اور بے شمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اُسمیں نشان دی ہیں ۔ اِس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتی طبع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے ؟

مرزا نے قاطع برہاں کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں ؛ اُنمیں سے فائدۂ اوّل کا ماحصل یہ ہے کہ " ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی بو آتی ہے اس لئے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہوکر اور ہندوستانیوں کو مسلّم نہ جاننا اور خود زباندانی کا دعوے کرنا بے معنی ہے ۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توراں سے آیا تھا ، اور میرا باپ دلّی میں پیدا ہوا ، اور میں آگرے میں ۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہلِ زباں سمجھتا ہوں میں بلاشبہ زباندان ہوں اور میری زباندانی اولاً خداداد سلامتی طبع کی بدولت ہے ؛ جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلّی نہیں پاتی ۔ دوسرے اِس وجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوئی ہے ۔ تیسرے مولانا عبد الصمد کے فیضِ صحبت سے جو مجھکو دو برس تک برابر حاصل رہا ۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اُس سے تربیت پائی ؛ اور بعد پچاس برس مشقِ سخن کی ۔ اب کہ مجھکو چھیاسٹھواں سال ہے ۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں ۔ اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا ۔ کہ ان باون برسوں میں اُسنے کس قدر معنی کے دروازے مجھپر کھولے ہیں ؛ اور میری فکر کو کس درجہ کی بلندی بخشی ہے ۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا ؛ اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شانِ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے ؛ اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا ۔ گویا نظیری کا یہ آہ آمیز مقطع میرے حسبِ حال ہے ۔

" تو نظیری ز فلک آمده بودی چو مسیح   [illegible] ایں پا رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ "

جتنے آدمیوں نے قاطع برہاں کے جواب لکھے ہیں ، اُنمیں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے ہیں ۔

اوران جوابوں میں زیادہ تر ظرافت اور شوخیِ طبع سے کام لیا ہے۔ کیس اُنکے طرزِ بیان کا خاکا اُڑایا ہے کیس اُس کی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے۔

مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع قاطع" کا جواب مرزانے کچھ نہیں دیا؛ کیونکہ اُسمیں فحش اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اُسکا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزانے کہا "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اُسکے لات مارو گے؟

ایک شخص مرزا احمد علی بیگ متوطنِ کلکتہ ہیں؛ جنھوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب مؤید البرہان لکھی ہے؛ جسکے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لئے چھان مارا ہے۔ اور شل اورمجیبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا۔ اور جو سخت الفاظ مرزانے صاحبِ برہان کی نسبت استعمال کئے تھے ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کئے ہیں۔ اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تاریخیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں اُسکے جواب میں مرزانے ایک رسالہ موسوم بہ تیغِ تیز لکھا ہے؛ اور ایک فارسی قطعہ بھی اُن کو لکھکر بھیجا ہے۔ جسکے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں، جو لطف سے خالی نہیں۔

خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود	خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است
با قتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند	لاٹہؔ و شوگیری و لطف مدار اکردہ است
داوری* گاہے بنا فرمود و دورے ہر سہ را	منصف و صدر امین و صدرِ اعلیٰ کردہ است

† لاٹہ جو ستادہ۔ شوگیری طرفداری ۱۲ * داوری گاہ محکمہ ۱۲

گر چنیں با ہندیاں دارد تولا در سخن　　من ہم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است

مطلب از بد گفتن من چیست ؟ گویا نیک مرد　　مزد ایں کار از حق - آمرزش تمنا کردہ است

صاحبِ علم و ادب ! وانگہ ز افراطِ غضب　　چوں سفیہاں دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است

در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد - بلے !　　ننگ دارد علم از کارے کہ آنہا کردہ است

انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع می کشد　　آں چہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است

من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت　　وائے بر وے گر بتقلیدِ من ایما کردہ است

زشت گفتم - لیک داد بذلہ سنجی دادہ ام　　شوخیِ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است

میکند تائیدِ برہاں لیک برہاں ناپدید　　نیست جز تسلیمِ قولش ہر چہ انشا کردہ است

شستیِ طرزِ خرامِ خامۂ برہاں نگار　　یا نمیدانست یا دانستہ اخفا کردہ است

بہرِ من توہین و بہرِ خویشتن تحسیں جا بجا　　ہم مرا، ہم خویش را، در دہر رسوا کردہ است

یافتم از دیدنِ تاریخہائے آں کتاب　　خود بذم گفت و بہ احبابِ خود ایما کردہ است

غازیاں ہمراہِ خویش آورد از بہرِ جہاد　　تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

قاطع برہان اور اُسکے متعلق مرزا کی جس قدر تحریریں ہیں اُن میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و تُرہات بھی درج ہیں۔

لفظِ فراز کو صاحب برہان اضداد میں سے گنتا ہے اور فراز کردن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونو بتاتا ہے۔ مگر مرزا اسکو اضداد میں نہیں گنتے ؛ بلکہ اُسکے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں ؛ اور جو اشعار مخالفوں نے سند میں پیش کئے ہیں مرزا نے اُنھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے۔ مگر چونکہ ہندوستان کے

تمام فرہنگ نگاروں نے فراز کو اضداد میں شمار کیا ہے۔ اسکی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ "اسکو اضداد قرار دینا ویسا ہی اجماع ہے جیسا کہ اہلِ شام نے خلافتِ یزید پر اجماع کیا تھا"

صاحب برہان کی چند عامیانہ غلطیاں اور اُسکے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں "خدا پرستاں! از بہرِ خدا این عربی مُعْجَم فارسی مداں (یعنی جامع برہان) نمی پرسم کیست؟ می پرسم کہ چیست؟ ایک اور جگہ نہایت طیش میں آکر لکھتے ہیں "چوں شناسائی حقیقت جوہرِ لفظ ندارد فرہنگ چرا می نگارد؟ بوریا می بافت، رسن می تافت، ہیزم می فروخت، گلخن می افروخت"

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر۔ جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا، اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ ازالۂ حیثیتِ عرفی کی نالش بھی کی تھی، مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخرکار اُنھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلّی کے بعض اہلِ علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بُلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں آیا فی الواقع اُن سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟ اُنھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لئے اُن فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! اُنھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا

بہر چہ درنگری جز بجنس مائل نیست   عیارِ بےکسیِ من شرافتِ نسبی ست*

*یعنی میری بیکسی کی وجہ شرافت نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے چونکہ شرافت نسبی میں کوئی میرا ہمجنس نہیں ہے اس لئے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا ۱۲

جب یہ مقدمہ داخلِ دفتر ہو گیا ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط مشتملِ
سب و شتم بھیجنے شروع کئے - جن میں شراب نوشی اور بدمذہبی وغیرہ پر سخت نفرین اور طعن و ملامت
لکھی ہوتی تھی - اُن دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی ؛ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے ۔ اور
جب چٹھی رساں ڈاک لیکر آتا تھا تو - اِس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو - اُن کا چہرہ
متغیر ہو جاتا تھا ۔ اتفاق سے اُنھیں دنوں میں نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں
آنا ہوا ۔ چونکہ مجھکو اِن نالائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا ؛ ایک روز مجھسے ایک
ایسی غلطی ہوگئی جس کے تصور سے مجھکو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی
کے نشے میں سرشار تھے ۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو ، اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں
میں سے اہلِ سُنت کو ، اور اہلِ سُنت میں سے صرف حنفیہ کو ، اور اُن میں سے بھی صرف اُن لوگوں
کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں ؛ نجات اور مغفرت
کے لائق جانتے تھے ۔ گویا دائرۂ رحمتِ الٰہی کو کوئن وکٹوریا کی وسعتِ سلطنت سے بھی - جس میں
ہر مذہب اور ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں - زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے
تھے ۔ جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اُسی قدر اِس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اُسکا
خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لئے ناگزیر ہے ؛ چونکہ مرزا کی ذات
کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اِس لئے ہمیشہ اُنکی حالت پر افسوس آتا تھا ۔ گویا یہ سمجھتے تھے
کہ روضۂ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائیگا ؛ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکیگی ۔
ایک روز مرزا کی بزرگی اُستادی ، اور کبر سنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھکر خشک زہد واعظوں کی

نصیحت کرنی شروع کی - چونکہ اُن کا ثقلِ سماعت انتہا کے درجے کو پہونچ گیا تھا، اور اُن سے بات چیت
ریر کے ذریعے سے کیجاتی تھی - نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھکر اُن کے سامنے
کیا - جسمیں اُن سے اِس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہوکر، یا بیٹھکر، یا ایما و اشارے سے؛
جس طرح ہوسکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہوسکے تو تیمم ہی سہی، مگر نماز ترک نہو۔
مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گذری؛ اور ناگوار گذرنے کی بات ہی تھی۔ خصوصاً اِس وجہ سے کہ اُنھیں
یں لوگ گمنام خطوں میں اُنکے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کررہے تھے
اریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھکر جو کچھ فرمایا وہ سُننے
ائق ہے۔ اُنھوں نے کہا: ساری عمر فسق و فجور میں گذری؛ نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ
نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہگئے ہیں؛ اب اگر چند روز بیٹھکر، یا ایما و اشارے سے
پڑھی؛ تو اِس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہوسکے گی؟ میں تو اِس قابل ہوں کہ جب وں
ے عزیز اور دوست میرا منھ کالا کریں، اور میرے پاؤں میں رسّی باندھکر شہر کے تمام گلی کوچوں اور
وں میں تشہیر کریں، اور پھر شہر سے باہر لیجاکر کتّوں، اور چیلوں، اور کوّوں کے کھانے کو (اگر وہ
چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اِس سے بھی بدتر
کیا جاے؛ لیکن اِس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ
ت میری زبان پر جاری رہتے ہیں "لا الٰہ الا اللہ"، "لا موجود الا اللہ"، "لا موثر فی الوجود الا اللہ"
شاید اُسی روز جب کہ یہ گفتگو ہوچکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھارہے تھے۔ چٹھی رساں نے
لفافہ لاکر دیا۔ لفافہ کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے اُنکو یقین ہوگیا کہ یہ کسی مخالف کا

ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں۔ لفافہ مجھکو دیا کہ اسکو کھولکر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اُسکے اظہار میں تأمل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگردِ معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اوّل سے آخر تک خود پڑھا۔ اُس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ "اس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اسکو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اسکو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچّے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتّر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا"

اسکے بعد میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھکر میرے پاس بھیجی۔ جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اُسکے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اس میں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے

بمقصدے کہ مرآں را رہِ خدا گویند — برو برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند

کسیکہ پائے ندارد چگونہ راہ رود — خود اہلِ شرع دریں داوری چہا گویند

ز رمزِ نخل انا اللہ گوئے ۔ ناآگاہ — حدیثِ جلوہ گہِ موسی و عصا گویند

مگر ز حق نبود شرم حق پرستاں را — کہ نامِ حق نبرند و ہمیں انا گویند

ز قولِ شاں نبود دل نشینِ اہلِ نظر — جز آں صفات کہ از ذاتِ کبریا گویند

نخواندہ در کتب و ناشنیدہ از فقہا — بغیرِ بے مزہ واگویہ ہا کہ واگویند

دم از وجودک ذنب* زدند بے خبراں — چہ ساں عطیۂ حق راگناہ ما گویند

بلے! گناہ بود دعوئ وجود از ما — باہل راز چنیں گوے تا بجا گویند

دگر ملامتیاں راچہ زہرہ یا یارا — اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند

نکردہ زر مس خود را و بہر عرض فریب — بہ پیشِ خلق حکایت ز کیمیا گویند

کساں کہ دعوے نیکی ہمی کنند - مرا — اگر نہ نیک شمارند بر چہ را گویند!

طمع مدار کہ یابی خطاب مولانا — بس ست ہمچو توئے راکہ پارسا گویند

بگوے مردہ - کہ در دہر کار غالب زار — از آں گذشت کہ درویش و بے نوا گویند

اس غزل کو دیکھکر مجھکو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمال شاعری کی نسبت جو خیالات مکنونِ خاطر ہیں؛ اور کبھی اُنکے اظہار کی نوبت نہیں آئی؛ اُن کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعہ میں بیان کیا جائے۔ چنانچہ قطعۂ ذیل ترتیب دیکر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

قطعہ

تو اے کہ رونقِ پیشینیاں بہم بشکست — ز نظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی

چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی — چہ بذلہ ہا کہ بہ اندازِ دلربا گفتی

* یہ ایک مشہور قول صوفیۂ کرام کا ہے۔ میں نے جو کچھ مرزا صاحب کو لکھکر دیا تھا اُس میں ایک موقع پر یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا۔ مرزا اُسپر اعتراض کرتے ہیں اور اُس کو تسلیم نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ "وجود ایک عطیۂ الٰہی ہے؛ پس اُس کو ہمارا گناہ کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ البتہ دعوی وجود گناہ ہے اگر اہلِ راز سے اس طرح کہا جاے تو وہ تسلیم کرسکتے ہیں"۔ مگر معلوم رہے کہ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ "وجودک ذنب" وہ ایک وجود واجب کے سوا اور کسی وجود کے قائل نہیں ہیں۔ وحدتِ وجود اُن کا اصل اصول ہے۔ پس اُن کے نزدیک وجود ماسوا عطیۂ حق نہیں ہے بلکہ وہم و خیالِ انسانی کے مخترعات میں سے ہے اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ "وجودک ذنب" ۱۲

رسید نشهٔ عرفاں چو ذکرِ مے راندی　　شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی

دوید ریشہ بدلہا جو حرفِ مہر زدی　　دمید نخلِ تمنّا چو از وفا گفتی

گہر بہ بزم نشاندی اگر ثنا خواندی　　اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی

ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی　　ہزار نکتۂ پوشیدہ بر ملا گفتی

ز سترِ تفرقہ و جمع قصہ ہا راندی　　ز سیرِ انفس و آفاق راز ہا گفتی

برآمد از دلِ بیگانگاں ترانۂ ذوق　　بہ محفلے کہ سخن ہائے آشنا گفتی

لطیفہ ہا کہ بہ لفظ و بیاں نمی گنجید　　تو چوں فرشتہ ز غیب آمدی و وا گفتی

بحق لطفِ کلامت کہ ہست بر دلِ ما　　کہ پایۂ سخن افراشتند تا گفتی

نوائے کہ ہر سخن نغزِ تو بدل جا کرد　　جز آں کہ در حقِ حالی برمزو وا گفتی

ہر آنچہ گفتہ اندر جوابِ عرضِ نیاز　　خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی

ولے بعربدہ از حرف چند با خویشم　　کہ گر نگفتہ ام آخر تو از کجا گفتی

عجب کہ قاعدہ دانِ نیاز مندی را　　سفیہ و معجب و خود بین و خود نما گفتی

عجب کہ چاشنی اندرز خاکساری را　　رہینِ ذوقِ نوا سنجیٔ انا گفتی

عجب کہ منفعلے را ز نقدِ ناسرہ اش　　بہ زرق در گروِ عرضِ کیمیا گفتی

نہ راہِ حرف بسویت نہ جائے من بدلت　　جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی

اگر نہ روئے سخن با تو بود می گفتم　　چگونہ گفتی؟ و چوں گفتی؟ و چرا گفتی

ولیک شرطِ ادب نیست بر تو خردہ گرفت　　ہر آنچہ در حقِ من گفتہ بجا گفتی

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اُس زمانے میں مجھکو نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم متخلص بہ شیفتہ و حسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور اُن دنوں میں وہ دلی آئے ہوے تھے، اور میں انھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گذرا تو اُنھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھکر بھیجا جو ذیل میں درج ہے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری	ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید	تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال	بر آں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے اداے عبادات عمر پیشینہ	دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھکو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعہ کا ذکر چھڑ گیا ہے اُسکو انجام تک پہونچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعہ پر میں نے ایک اور قطعہ لکھکر اُن کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادۂ بسوے رہی	سزد کہ جان گرامی براں نثار کنم
شکایتے کہ تواں گفت عین اخلاصش	گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم
نماند قاعدۂ شکر بے ریا بجہاں	اساسِ دوستی از شکوہ استوار کنم

چو شکوہ جز بتقاضائے دوستی نبود | ز غیر شکر و شکایت ز دوست دار کنم
سرشتِ پاک و دلِ صاف دادہ اند مرا | بحرفِ تلخ دلے خالی از غبار کنم
خوش آں کہ ساز کنم از تو شکوہ بیجا | تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
خوش آں کہ عذرِ تو چوں در کند مرا ز پے | دگر بہ پیشِ تو تمہیدِ اعتذار کنم
براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس | ز کارہائے جہاں خاصہ ایں کار کنم
ز کردہ توبہ نمایم ز گفتہ استغفار | دگر سپاسِ تو پنہان و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہونچا اُسپر یہ لکھکر کہ "بس اب بیت بحثی موقوف" میرے پاس بھیج دیا اِسکے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

عربی دانی

مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا، مگر چونکہ علمِ لسان سے اُن کو فطری مناسبت تھی۔ اُنکی نظم و نثر اُردو و فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گذرتا کہ یہ شخص عربیت اور فنِ ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو اُنھوں نے ہر جگہ اُسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔ شاعری جسکا ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔

فارسی دانی

اُس سے قطع نظر کرکے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہلِ زبان کے اسالیبِ بیان پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہلِ زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور ہوگا۔

عروض

اِسکے سوا فنِ عروض میں بھی اُن کو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سُنا گیا ہے کہ باوجود کمال شاعری کے اس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں، اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جنکے وزن اور

قول کا اندازہ صرف استقامتِ طبع سے ہو سکتا ہے۔ اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں "من ندانم فاعلاتن فاعلات ✦ شعر می گویم بہ از قند و نبات ✦ مرزا کا ایسا حال نہ تھا۔ چنانچہ فارسی اور اردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے اُن بحروں میں نہیں چل سکتے۔ علم نجوم سے کسی قدر، اور اُسکی اصطلاحات سے پوری واقفیت اُن کو تھی۔ چنانچہ اُنکی نظم فارسی میں جا بجا اِس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ علم تصوّف سے جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب ست" اُن کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُنکے مطالعے سے گذرے تھے۔ اور سچ پوچھیے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔ فن تاریخ اور سیاق✦ و مساحت وغیرہ سے اُن کو مطلق لگاؤ نہ تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی مہر نیمروز لکھ رہے ہیں کسی نے اُن کو مورخ سمجھکر کچھ سوالات کئے ہیں۔ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "میں فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے آشنا بیگانہ ہوں کہ اِن فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازانِ دفترِ شاہی خلاصۂ حالات از روی کتب اردو میں لکھکر میرے پاس بھیجدیتے ہیں، میں اُسکو فارسی کر کر حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں۔ میں اِسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں، مورخ نہیں ہوں۔

"ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم ... از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

مرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت شیریں اور دلاویز تھا جیسا کہ اکثر اہلِ ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاصکر مشاعروں میں حد سے

✦ لطیفہ۔ شمس العلما مولوی ذکاءاللہ سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں؟ اُنھوں نے کہا "ایسا ہی دخل تھا جیسا مجھے شاعری میں ہے"

زیادہ دلکش اور موثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے۔ جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے۔ چونکہ اُنکے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اس لئے صبح ہوگئی تھی۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں؛ یہ کہکر اوّل اُردو طرح کی غزل اور اُسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُر درد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدر دان نہیں پاتے۔ اور اس لئے غزلخوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنوں شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب سید الشہدا کی منقبت میں اُنھوں نے لکھا تھا پڑھا۔ سنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزم عزا بن گئی تھی۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ مفتی صدر الدین خاں مرحوم بھی موجود تھے اتفاق سے اسی حالت میں مینہ بھی برسنے لگا مفتی صاحب نے کہا "آسماں ہم گریست"

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلف الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندرگاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلس عزا تھی، اور بارش ہو رہی تھی۔ بانی مجلس نے مجھسے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو۔ میرے پاس اُسوقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی۔ اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے؛ میں نے وہی پڑھ دیئے۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی۔ عرب، عجم، اور ہندی سب اس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھسے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے؛ خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے رہے

مُزد شفاعت وصلۂ صبر و خوں بہا ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اِسی شعر پر مصرعے لگائے تھے مگر اُنکو خود پسند نہ آئے اور کہا
(جس رتبے کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکتے ۔

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

وسعت اخلاق

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے ۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے ۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اُسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا ۔ دوستونکو دیکھکر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے ۔ اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے ۔ اِسلئے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے ۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے ۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرضِ عین سمجھتے تھے ۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا ۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے ۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے ۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں اُنکے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُنکی تعمیل کرتے تھے ۔ لوگ اُنکو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا ۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھکر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے ۔ اُنھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے اُسنے کتاب کی رسید بھیجی ہے، اور قیمت دریافت کی ہے ۔ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں " حرفِ پرسشِ مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت ؟ ہنجار نوازشِ نیازمنداں بے نوا نہ اینست ۔ بے سرمایہ ام نہ فرومایہ ۔ سخنورم نہ سوداگر ۔ موئینہ پوشم نہ کتاب فروش ۔ پذیرندۂ عطایم نہ گیرندۂ بہا ۔ ہرچہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند نذر ست ، و ہرچہ شاہزادگاں

آزادگاں بخشند تبرک ۔ بیع و شرا نیست ۔ چون و چرا نیست ۔ ہر چہ فرستادہ ام ارمغان ست ۔ و ہر چہ خواہم فرستاد ارمغاں خواہد بود"

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے ؛ باایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں "جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا ۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے ، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے ۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی ۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں ۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کرونگا" باوجود اسکے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے ۔ ایک دفعہ کسی مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی ۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں " لا حول ولا قوۃ ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی ؛ اگر میں شعر سے بیزار نہوں تو میرا خدا مجھسے بیزار ۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا ؛ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے"

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا ۔ سائل اُنکے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا؛ اُنکے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے ۔ غدر کے بعد اُنکی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہو گئی تھی ؛ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا ؛ مگر وہ عزیزوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے ؛ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے ۔

غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹننٹ کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اس لئے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب۔ جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد انکی حالت سقیم ہو گئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی انکو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھکر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپنے کہاں سے لی؟ مجھے اسکی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے؛ آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ انھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے، اور میں نے اسی وقت اسکو پہنا ہے؛ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائینگے! پھر ادھر ادھر دیکھکر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ انکی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں

اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھیرا، کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتوان، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں"

حافظہ

جیسی مرزا کی طبیعت میں درّاکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی اسی طرح اُنکا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اُنکے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا، ہمیشہ کرایہ کی کتابیں منگوا لیتے تھے، اور اُنکو دیکھکر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جسکی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے اُن کے کلام پر اعتراض کئے تھے، اور جنکے جواب میں مرزا نے مثنوی بادِ مخالف لکھی تھی، اُن کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھکر علحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خطوط میں اُنکو مفصل بیان کیا ہے۔ برہانِ قاطع پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے۔ اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک منشنے آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اُسکی تہ کو پہونچ جاتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم گلشنِ بیخار میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں "مضامینِ شعری را کما ہو حقہٗ می فہمد، ذہمیچ نکات و لطائف پے می برد؛ واین فضیلتے است کہ مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبعِ سخن شناس داری باین نکتہ می رسی؛ چہ۔ خوش فکر اگرچہ کمیاب ست اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حالِ کسیکہ از ہردو شربے یافتہ، وحظے ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ" نواب ممدوح نے مجھسے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن فہمی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے "دور نہیں، حور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اُسمیں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر اُنسے کہا کہ "اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف وقافیے میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جسکا مطلع یہ ہے "عشق عصیانست اگر مستور نیست + کشتۂ جرم زباں مغفور نیست" ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں۔ جیسی ہماری غزل ہے۔ اُردو غزل لکھتا تو اُسکا مطلع اس طرح ہوتا "عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں + کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں" آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور۔ بغیر اسکے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے" چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمے سے بہت پست ہوگیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کرینگے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دینگے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہونچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلع ہیں؛ ان میں آپ محاکمہ کیجیے

کہ کونسا مطلع اچھا ہے ؟ اور بطور تمہید کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا ۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سُنکر سر دُھننے لگے ؛ اور تحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا ؟ اور اِس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اِس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملیگی ۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا ؛ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے ۔

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور اُن کو خوب سمجھتے تھے ۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ ۔ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا ۔ مطالعہ کر رہا تھا ؛ اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ اتفاقاً اُسی وقت مرزا صاحب آنکلے ۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا ۔ اُنھوں نے کسی قدر غور کے بعد اُسکا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ صاحب بھی شاید اُس سے زیادہ نہ بیان کرسکتے ۔

حسنِ بیان اور ظرافت

مرزا کی تقریر میں اُنکی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اِسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور اُنکی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے ۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے ؛ مگر جو کچھ اُنکی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا ۔ ظرافت مزاج میں اِس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے ۔ حسنِ بیان ، حاضر جوابی ، اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُنکی خصوصیات میں سے تھا ۔

لطیفہ

ایک دفعہ جب رمضان گذر چکا تو قلعے میں گئے ۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے ؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا ۔

لطیفہ

ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے ۔ انکے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا ۔ جب چھتے سے گذر کر دیوانخانے کے دروازے پر پہنچے ۔

تو وہاں نواب صاحب اُنکے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے اُن کو دیکھکر یہ مصرع پڑھا "کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکیست"۔ جب دیوانخانے میں پہنچے تو اُسکے دالان میں بسبب شرقِ رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا "ایں خانہ تمام آفتاب ست"۔ ایک صحبت میں مرزا۔ میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے؛ اُنھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا "میں تو تمکو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں"

لطیفہ

مولوی امام بخش صہبائی مرحوم کی رائے پنجرقعہ اور مینا بازار کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونو تحریریں بھی مثل سہ نثر کے مُلا ظہوری کی ہیں مگر مرزا اِسکے خلاف تھے۔ ایک جلسے میں دونو صاحب موجود تھے۔ اتفاق سے یہ ذکر چھڑ گیا۔ مرزا نے کہا "قطع نظر اِسکے کہ سہ نثر کی اور پنجرقعہ و مینا بازار کی طرز میں بون بعید ہے۔ ظہوری کی شان سے نہیں ہے کہ وہ نثر کے ساتھ نظم نہ لکھے۔ تمام سہ نثر میں ایسا ایک صفحہ بھی مشکل سے نکلیگا جس میں نثر ہو اور نظم نہو۔ برخلاف اِسکے تمام پنجرقعہ و مینا بازار میں ایک شعر کے سوا۔ کہ وہ بھی ظہوری کا نہیں ہے۔ نظم کا کہیں پتا نہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم و نثر دونو چیزوں پر برابر قدرت رکھتا ہو اُسکی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے" مولانا صہبائی نے کہا "ایسے اتفاقات اکثر ہو جاتے ہیں یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے"، مرزا نے کہا "بے شک! مگر یہ ایسا اتفاق ہوگا کہ ایک شخص ہر ایک لحاظ سے نہایت سنجیدہ، شایستہ، اور معقول آدمی ہے؛ مگر اتفاق سے کبھی کبھی کاٹ بھی کھاتا ہے" یہ سُنکر سب لوگ ہنس پڑے؛ اور مولانا صہبائی مُسکرا کر خاموش ہو رہے۔

لطیفہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا؛ اور اُسکے ایک جانب ایک کوٹھڑی تنگ و تاریک تھی۔ جس کا در اِس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھڑی میں

بہت جھک کر جانا پڑتا تھا ؛ اُسمیں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے ۔ ایک دن - جبکہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا - مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے ۔ اُسوقت مرزا صاحب اُسی کوٹھڑی میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے ۔ مولانا بھی وہیں پہونچے ؛ اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھکر کہنے لگے کہ "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے ؛ مگر آج اِس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہوگیا"، مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے ؛ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھڑی تو ہے ۔

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہوتی تھی - اگر کوئی اُنکے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی تیار ہوجاتی ۔

خودداری

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا ؛ مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے ۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی ۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے ۔ عمائدِ شہر میں سے جو لوگ اُنکے مکان پر نہیں آتے تھے ؛ وہ بھی کبھی اُنکے مکان پر نہیں جاتے تھے ۔ اور جو شخص اُنکے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُسکے مکان پر ضرور جاتے تھے ۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خان مرحوم کے مکان پر آئے ؛ میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا ؛ نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا ؟ مرزا نے کہا مجھکو اُن کا ایک آنا دینا تھا ؛ اِس لیے اول وہاں گیا تھا جو وہاں سے یہاں آیا ہوں ۔

ظرافت

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم - بہرٹ میں سوار - مرزا کے مکان کے پاس سے

بغیر ملے نکل گئے ۔ مرزا کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ " کہ آج مجھکو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں ۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہوں " ۔ جب یہ رقعہ دیوان جی پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے ۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی ۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے ، یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی اُنھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا ۔ اخیر میں اُن کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی ۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے ۔ دن کو جو کھانا اُن کے لئے گھر سے آتا تھا اُسمیں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا ۔ ایک پیالے میں بوٹیاں ، دوسرے میں لعاب ، یا شوربا ، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا ، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی ، ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی ، اور شام کو کسی قدر شامی کباب ، یا سیخ کے کباب ؛ بس اس سے زیادہ اُنکی خوراک اور کچھ نہ تھی ۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا ، اور دسترخوان بچھا ؛ برتن تو بہت سے تھے ؛ مگر کھانا نہایت قلیل تھا ۔ مرزا نے مسکرا کر کہا " اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے ؛ اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا " ۔

فواکہ میں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا ۔ آموں کی فصل میں اُن کے دوست دُور دُور سے اُنکے لئے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے ؛ اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے ۔

اُنکے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانے میں اُنھوں نے امام بخش ناسخ

کے متوتی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے۔ اُنہیں لکھتے ہیں "نخی منکم بندہ ام، و قدرے ناتواں؛ ہم آرائشِ خوانِ جویم، و ہم آسائشِ جاں۔ خِرَد وراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندرست؛ و اہلِ کلکتہ بر آنند کہ قلمرو انبہ بنگلی بندرست۔ آرے انبہ از بنگلی، و گل از گلشن؛ ایثار از جناب، و سپاس از من۔ شوق می سگالد کہ تا پایانِ موسم دو سہ بار بخاطرِ دلی نعمت خواہم گذشت۔ و آز می نالد کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواہم گشت"

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ - جن میں مرزا بھی تھے - باغِ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسّر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اِس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے" بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں + کایں فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں + اِسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے اُن کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے، اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھیے "آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔"

مرزا کی نیّت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہلِ شہر تحفتہً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے،

باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی راے بیان کر رہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی راے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار اُنھوں نے مقرر کر لی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُسکی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اُسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا، اور کنجی مجھکو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیرخواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار ہی بہت کم پیتے تھے، دوسرے اُسمیں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے۔ جس سے اُسکی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست   آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اِس قدر احتیاط اور اعتدال کے اِس کافر نشے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جسکی شکایت سے اُنکے تمام اُردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست، جن سے نہایت بے تکلفی تھی، اکثر شام کو اُن کے پاس جا کر بیٹھتے تھے، اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔

ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے ؛ اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے ۔ میر مہدی پانو دابنے لگے ۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے ، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے ؟ اُنھوں نے نہ مانا ؛ اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دے دیجئے گا ۔ مرزا نے کہا ہاں اسکا مضائقہ نہیں ۔ جب وہ پیر داب چکے اُنھوں نے اُجرت طلب کی ۔ مرزا نے کہا "بھیّا کیسی اُجرت ؟ تم نے میرے پانو دابے ، میں نے تمھارے پیسے دابے ؛ حساب برابر ہوا۔"

ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے میں بھی وہاں موجود تھا اور اُنکے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا ۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں ، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا ۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبد الاحد خاں کے دسترخواں پر اُن کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے ، مگر خاص اُنکے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی ۔ وہ اُسکے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے ۔ ایک روز اُنکے لئے مزعفر پکا تھا ؛ وہی اُنکے سامنے لگایا گیا ۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منھ لگا ہوا تھا جو اُسوقت دسترخوان پر موجود تھا ۔ نواب نے اُسکو کھانا دینے کے لئے خالی رکابی طلب کی ۔ اُسکے آنے میں دیر ہوئی ۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا ؛ اور کہا "حضور اور رکابی کیا کیجیے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے ،، نواب یہ فقرہ سُنکر پھڑک گئے اور وہی رکابی اُسکی طرف سرکا دی"

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسماں کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھکر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے ۔ تاروں کو تو دیکھو

کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؟ نہ تناسب ہے، نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے، نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خود مختار ہے، کوئی دم نہیں مار سکتا۔

ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا قبلہ وکعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔ مرزا نے کہا میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا، بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے انھوں نے شراب کی جابجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اسکو بہت برا جانتے تھے؛ اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے۔ باوجود اسکے انھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں

شراب کے متعلق انکی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے انکے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا بھائی جسکو شراب میسر ہے اسکو اور کیا چاہیے جسکے لئے دعا مانگے۔

ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں "بے مے نکند درکف من خامہ روائی ÷ سردست ہوا آتش بے دود کجائی ÷ میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں؛ ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ وپے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب!!! ہائے غضب ہائے غضب"، یہ خط غدر کے بعد اُس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت وتنگدستی کے کچھ پیتے پلاتے نہیں ہیں۔

میر مہدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لئے کیا گیا تھا اُسکا ذکر لکھا ہے اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں

"میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامۂ شمارا خواندند و بہ ذوقِ شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت سخن از بادۂ ناب نبود، ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے،،

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جس قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہونگے ؛ یہاں ایک شعر اُردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

خجلت نگر کہ در عسَستم نیافتند — جز روزۂ درست بہ صبا کشودہ

غالب بہ سخن گرچہ کست ہمسر نیست — از نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست

مے خواہی و مفت و نقد و آنگہ بسیار!!! — ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

مرزا اسلام کی حقیت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصلِ اصول اور رکنِ رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے ؛ مگر جیسا کہا گیا ہے ،،من احب شیئاً اکثر ذکرہٗ ،، توحیدِ وجودی اُنکی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

امید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را — بہ دوستیِ سخن ہائے آشنا بخشند

اُنھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیتِ نبی کی محبت ؛ اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اُسکے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکماے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اُسکے قائل نہ تھے چنانچہ اُنھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں "ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن + دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے "درگردین زاہداں بجنت گستاخ + واں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ + چوں نیک نظر کنی زروے تشبیہ + ماند بہ بہائم و گلگشت زار فراخ"

مرزا باوجودیکہ احکامِ ظاہری کے بہت کم پابند تھے ؛ لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو اُن کو سخت رنج ہوتا تھا ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ؛ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھکو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے ؛ مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی۔ جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر اُن سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا ؛ خواہ اس میں اُنکو کوئی کافر سمجھے ؛ یا رند مشرب کہے ؛ یا بدمذہب جانے۔

غدر کے بعد۔ جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر ؛ اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار ؛ پھر میں

نہیں جانتا کہ کہار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر انکا میلانِ طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھکر حضور کو سُنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ اُن میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھکو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھسے عداوت گہری　　کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری

دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی ؟　　شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری ؟

دہریت اور تصوف میں جو بُعد بعید ہے وہ ظاہر ہے ؛ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے پس صوفی دہری کیونکر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سُنی ہونے میں ضرب المثل ہیں ؛ یہاں تک کہ شیعہ اُن کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراء النہر سے تھی اسلیے کہتے ہیں کہ ایک ماوراء النہری رافضی یا شیعی کیونکر ہو سکتا ہے ؟

جو لوگ مرزا کی طرز مزاج اور طرز کلام سے ناآشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا ؛ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب

رباعیاں صرف بادشاہ کے خوش کرنے اور اہلِ دربار کے ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں ؛ کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو ۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کرکے پڑھا

"ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب   نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب"

رمضان کا مہینا تھا ؛ ایک سُنّی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے ۔ عصر کا وقت تھا ۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا ۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا "کیا جناب کو روزہ نہیں ہے ؟ مرزا نے کہا "سُنّی مسلمان ہوں ؛ چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں"

ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے ۔ اُس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے ۔ انکا مذہب اثنا عشری تھا ۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اُسکے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی ۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائیگی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤنگا ۔ چنانچہ انہوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے ؛ حضور مدد فرمائیں ۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا ۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے ۔ اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا ۔

اِس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اِس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا؛ اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اِسکے تدارک کے لئے کچھ رسالے شائع کرائے، اور بہت اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی۔ جسکا نام غالباً دمغ الباطل رکھا گیا تھا، اور جسمیں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اِس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہونچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اِس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُسکی تعمیل کرتا ہوں۔ اِس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔

مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودیکہ تیزی ذہن اور سلامتی طبع دونو ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں؛ مرزا میں یہ دونو باتیں بوجہ اتم موجود تھیں۔ اِسی سلامتی طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشقِ سخن میں جو ٹیڑھا رستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا۔ بغیر اِسکے کہ کوئی اُستاد رہبری کرے۔ جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اُسی قدر آہستہ آہستہ اُس سے انحراف ہوتا گیا؛ اور آخرکار اساتذۂ مسلّم الثبوت کی روش مستقیم پر آرہے۔

سلامتیِ طبع

مرزا از راہ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں اُفتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں؛ مگر مدح و ستائش میں مجھسے اُن کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ مرزا کا یہ کہنا

بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ جو زور اُنکی تشبیہوں میں پایا جاتا ہے وہ مدح میں آکر باقی نہیں رہتا۔ مگر ہم
سکو اُن کے نقصِ شاعری پر محمول نہیں کرتے؛ بلکہ غایت درجے کی سلامتِ ذہن اور استقامتِ طبع
ں دلیل جانتے ہیں۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کو چمکانا، اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا، اور مبالغہ
ا اغراق کا طوفان اُٹھانا فی الحقیقہ شاعر کا کمال نہیں ہے؛ بلکہ جس قدر اُسکی طبیعت ان باتوں سے ابا
نی ہے اُسی قدر جاننا چاہیے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی
ماری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گذری؛ کیونکہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔ مگر فی الحقیقہ
یسا کہ ہم آگے بیان کرینگے۔ اُن کو مدح کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہیے ویسا نہیں آتا تھا۔

اس مقام پر ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ جس سے مرزا کی سلامتی طبع کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔
انا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور اُن کو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر
تے تھے۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی؛ اُنھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ
مائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھدو۔ جس میں اُنکے بڑے بڑے اور مشہور
مدوں کی تردید اور خاصکر امتناع نظیر خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح اور بسط کے ساتھ بیان کرو۔
مسئلے میں مولانا اسمعیل شہیدؒ کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے؛
ع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت کا مثل اس لئے پیدا نہیں ہوسکتا کہ اُسکا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت
منافی ہے؛ نہ اس لئے کہ خدا اُسکے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ برخلاف اسکے مولانا فضل حق کی یہ رائے
کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے؛ اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کرسکتا اسی طرح خاتم النبیین
ل بھی پیدا نہیں کرسکتا۔

مرزا صاحب پر یہ فرمائش ہوئی کہ اس مسئلے پر جو رائے مولانا فضل حق کی ہے وہ فارسی نظم میں بیان کیجائے۔ مرزا نے اوّل عذر کیا کہ مسائلِ علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے۔ مگر اُنھوں نے نہ مانا۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی۔ جو کہ اُنکے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے۔ لکھکر مولانا کو سنائی۔ اُنھوں نے بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ اگر میں فارسی شعر میں تمھاری برابر مشاق ہوتا تو بھی ایسی خوبی سے اِن مطالب کو نہ ادا کر سکتا۔ مگر جو کچھ مرزا نے مسئلۂ نظیرِ خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا اُسپر مولانا سخت ناراض ہوے۔ مرزا نے صاف صاف تو یہ نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے؛ مگر اس مضمون کو اس پیرائے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہو سکتا؛ لیکن خدا قادر ہے کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کر دے اور اُسمیں خاتم النبیین کا مثل جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو خلق فرماوے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است	قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے	ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود	رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر؟	یا بیک عالم دو خاتم خوب تر؟
در یکے عالم دو تا خاتم مجوے	صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے

جب مرزا اوّل بار مثنوی لکھکر مولانا کے پاس لائے تو مضمون مذکور کو اس اخیر شعر پر ختم کر کے لائے تھے۔ مولانا نے فرمایا یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں؟ نہیں بلکہ

اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔ پس اِس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال
اور جس طرح میں کہتا ہوں اُس طرح بیان کرو۔ مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصومت تھی اور نہ انکے مخالفوں
سے کچھ تعلق تھا؛ بلکہ صرف دوست کی رضاجوئی مقصود تھی۔ اُنھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل
کی۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اُسکو تو اُسی طرح رہنے دیا مگر اُسکے آگے چند اشعار اضافہ کرکے کلام کو اس طرح مربوط کردیا۔

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے — خردہ ہم بر خویش می گیرم ہمے
اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ — دانم از روئے یقینش خواندۂ
ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکمِ ناطق معنیِ اطلاق راست
منشأ ایجادِ ہر عالم یکیست — گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

اِسکے بعد اِسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے؛ اور پھر مثنوی کو اِن دو شعروں پر جن میں نظیر خاتم النبیین
کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کردیا ہے۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است — لاجرم مثلش محالِ ذاتی است
زیں عقیدت برنگردم والسلام — نامہ را در ہم نوردم والسلام

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی؟ اور
اعوجاج سے کس قدر اُنکا ذہن اِبا کرتا تھا؟ باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اِس مسئلے کے متعلق جو کچھ
اُنکی راے تھی مرزا کے خوب ذہن نشین کردی تھی اور مرزا اُسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر
جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آکر سیدھی ہو جاتی ہے اِسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی
راے کے تمام بَل نکال ڈالے اور بغیر اِسکے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی وہ

اسکے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔ پھر اُسکے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے؛ اُسکو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔

ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اُسکے ہر ایک شعر پر۔ خواہ اچھا ہو خواہ بُرا۔ برابر تحسین و آفریں کی جاتی ہے اور اچھے اور بُرے شعر میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی؛ مرزا کی عادت بالکل اسکے برخلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو جب تک اُسکا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اُسکی تعریف نہ کرتے تھے۔ اخیر عمر میں تو اُن کا ثقلِ سماعت انتہا کو پہونچ گیا تھا؛ مگر پہلے ایسا حال نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر و سخن سُن لیتے تھے؛ مگر جب تک کوئی شعر اُن کے دل میں نہ چبھتا تھا ٹس سے مس نہوتے تھے۔ اُنکے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے؛ اور اسی لئے اُنکی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودیکہ اُن کی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی۔ شعر کی داد دینے کا جو طریقہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا اُسکو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر اُن کے دل میں چبھ جاتا تھا اُسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ذوقِ سخن اُن کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق جنکی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی۔ ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علیخاں مرحوم نے اُنکا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے ... مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

خانِ مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اسکی بھنک پڑ گئی فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھسے کہا بھیّا تم نے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سُنکر نہایت متعجب

ہوے؛ اور مجھسے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اس شعر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دے دیتا"، اس شعر کو بھی اُنھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے

دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار   لیکن کوئی خواہاں نہیں وہاں جنسِ گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اُسپر وجد کرتے تھے۔

"رُخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں   اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے"

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اِس قدر متاثر ہوتے تھے کہ اُنکی تعریف میں شاید اُنکا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھکر اُسکی بے انتہا تعریف کی؛ اور یہ کہا "کہ اگر میں اب رشک کرنیکے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد"

مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقة بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور ترحیح و مرنجاں مرنج واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے؛ مگر تقریظ نگاری کا اُنھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہو اور صاحبِ کتاب خوش بھی ہو جاے۔ بہت ساحصّہ تمہید میں، یا مصنّف کی ذات اور اسکے اخلاق، یا اُسکی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو مجمل

نہوں۔ختم ہوجاتا تھا۔ انہیں میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہوتے تھے، اور مصنف کے خوش کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے، لکھدیتے تھے۔ اِسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپ نے ستائش میں مضائقہ کیا ہے۔

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ۔ جو کلیات نثر غالب میں موجود ہے۔ لکھکر بھیجی تو اُنھوں نے بھی اسی قسم کی شکایت کی تھی۔ مرزا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھکو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کروں۔ میرے قصیدے دیکھو؛ تشبیب کے شعر بہت پاؤگے؛ اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفٰے خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مدح کتنی ہے؟ مرزا رحیم الدین بہادر حیاتخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوانِ حافظ کی۔ جان جاکوب بہادر کی فرمائش سے لکھی ہے اُسکو دیکھو؛ کہ فقط ایک بیت میں اُنکا نام اور اُنکی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُسکی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہمکو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اُسکے عوض ایک فقرہ اور لکھدیا ہے۔ اِس سے زیادہ ہمچمیٰ میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے؛ اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اِس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے۔ کس واسطے کہ اُن کے کان اِس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانینگے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔

(نثر) سید احمد خاں نے جب نہایت جانفشانی اور عرقریزی سے آئین اکبری کی تصحیح کی تو دلی کے

مشاہیر نے اُسپر نثر میں تقریظیں لکھی تھیں، اور مرزا نے نظم میں ایک مثنوی لکھی تھی جو اُسکے آخر میں موجود ہے۔ باوجودیکہ مرزا کو سرسید کی خاطر بہت عزیز تھی، اور وہ اُن سے اور اُنکے خاندان سے مثل یگانوں* کے ملتے تھے، مگر چونکہ مرزا ابوالفضل کی طرزِ تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے، اور جو آئین اُس کتاب میں لکھے ہیں اُنکو اِس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ و پوچ سمجھتے تھے، اور تاریخ کا مذاق جیسا کہ خود اُنھوں نے اعتراف کیا ہے بالکل نہ رکھتے تھے اِس لئے آئینِ اکبری کی تصحیح کو اُنھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو اُنکی یہ راے غلط ہو یا صحیح۔ مگر جو کچھ آئینِ اکبری اور اُسکی تصحیح کی نسبت اُن کا خیال تھا اُسکو تقریظ میں ظاہر کئے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ اُس مثنوی کے اوّل کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب — یافت از اقبالِ سیّد فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی — کہنگی پوشید تشریفِ نوی
ویں کہ در تصحیحِ آئیں راے اوست — ننگ و عارِ ہمتِ والاے اوست
دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد — خود مبارک** بندۂ آزاد کرد
گوہرش را آنکہ نتواند ستود — ہم بریں کارش ہمی باید ستود
بر چنیں کارے کہ اصلش ایں بود — آں ستاید کش ریا آئیں بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم — در وفا اندازہ دانِ خود منم

* مرزا آثار الصنادید کی تقریظ میں سرسید کی نسبت لکھتے ہیں "با ہمگنان نسبت دلبستگی از فرزانگی بآئین [illegible] [illegible] و با منش [illegible] [illegible] در نشینی بہ پیوند خویش دانا"

** مبارک بندہ آزاد کردن بہت کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اسمیں لطف یہ ہے کہ ابوالفضل کے باپ کا نام مبارک تھا۔

گر بدیں کارش نگویم آفریں　　　جائے آں دارد کہ جویم آفریں

اسکے بعد انگریزوں کے آئین وقانون وایجادات کسی قدر بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ان چیزوں کے سامنے پچھلے آئین سب تقویم پارینہ ہوگئے ہیں اسکے بعد لکھتے ہیں

طرز تحریرش اگر گوئی خوش ست　　　نے فزوں از ہرچہ می جوئی خوش ست

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است　　　گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

سیداً فیاض را اشمر بخیل　　　نوزمی ریزد رطب بازان نخیل

مردہ پروردن مبارک کار نیست　　　خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

غالب آئین خموشی دلکش ست　　　گرچہ خوش گفتی وگفتن ہم خوش ست

در جہاں سید پرستی دین تست　　　از ثنا بگذر دعا آئین تست

ایں سراپا فرو فرہنگ را　　　سید احمد خانِ عارف جنگ را

ہرچہ خواہد از خدا موجود باد　　　پیشکارش طالع مسعود باد

چونکہ اس تقریظ میں آئین اکبری کی تنقیص کی گئی تھی اور سرسید نے جو ایک نہایت مفید کام کیا تھا اُسکی کچھ داد نہیں دی گئی تھی بلکہ اُسکو غیر مفید ظاہر کیا گیا تھا اس لئے اُنھوں نے آئینِ اکبری کے آخر میں مرزا کی تقریظ کو نہیں چھپوایا۔

مرزا کی دراکی اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ۔ باوجودیکہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اپنے فن میں محققانہ

* اپنی شاعری اور انشاپردازی کی طرف اشارہ ہے ۱۲

چال چلتے تھے؛ اور اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جامع برہانِ قاطع کی شہرت اور ناموری اُنکو اُسکا تخطیہ کرنے سے مانع نہیں ہوئی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یزداں دلِ دانا وچشمِ بینا بہرآں دادہ است کہ کارِ دانش وبینش ازیں ہردو گوہر پُر فرگیریم؛ وہرچہ بنگریم جز بہ ستوریِ دانش آں را نہ پذیریم۔ اُستادی وشاگردی پیری ومریدی نیست کہ تنہا اعتقاد بس باشد؛ ودریں گلہ مشہور کہ "پیرمن خس ست واعتقادِ من بس ست" از باز پرس ایمنی روے دہد" حالانکہ وہ ایران کے نامور شعرا کا نہایت ادب کرتے تھے اور اُنکا ذکر ہمیشہ تعظیم اور احترام کے ساتھ کرتے تھے؛ پھر بھی اندھوں کی طرح اُنکی تقلید نہ کرتے تھے۔ جو امور سماع اور نقل سے علاقہ رکھتے تھے اُن میں اُن کے کلام کو بے چون وچرا تسلیم کرتے تھے، مگر جو باتیں عقل اور درایت سے تعلق رکھتی ہیں اُن میں اُنکی تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ ایک خط میں حزیں کا۔ جسکو وہ بہت بڑا اُستاد جانتے تھے۔ یہ مطلع نقل کرتے ہیں "زِ نزاکت زِ سوادی آں نازنیں سوار ہنوز + زِ سبزہ می دمد انگشتِ زینہار ہنوز" پھر لکھتے ہیں کہ اس مطلع میں ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے؛ متتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا، یہ غلط محض ہے، یہ ستم ہے، یہ عیب ہے، اسکی کون پیروی کریگا۔ حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اسکو سند نہ جانو؛ اور اسکی پیروی نہ کرو۔ ایک خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے، کیا آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟

مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا، یا کوئی عمدہ تصرف اُنکے شعر میں کرتا تھا؛ اُسکو فوراً تسلیم کر لیتے تھے؛ اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔ مثنوی دردوداغ میں اُن کا ایک مصرعہ تھا "مد خوک شد وپنجہ زدن ساز کرد" جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۂ ناطق مکرانی کو بھیجی تو اُس نے مرزا کو

[illegible] سُم [illegible] فرمود بہ اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سُم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود'' مرزا
نے اسکے جواب میں صاف لکھدیا کہ اگر کلیاتِ فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہونچ جاتا تو میں اِس لفظ
کو بدل ڈالتا، اور اُس مصرع کو اِس طرح بنا دیتا ''خوک شد و بہ نفسی ساز کرد''، چنانچہ جب مرزا کا کلام
دوسری بار چھپا تو اُنھوں نے یہ مصرعہ اسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے۔

ہمچناں در تتقِ غیب ثبوتے دارند | بوجودے کہ ندارند زخارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو
جب یہ شعر سُنایا تو اُنھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اِسکی جگہ ثبوت بنا دو۔
چنانچہ طبع ثانی میں اُنھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے اِسیطرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرعہ یہ ہے

عیدِ اضحےٰ بسر آغازِ زمستاں آمد

مرزا نے اول عیدِ قرباں لکھا تھا پھر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے کہنے سے عید اضحےٰ بنا یا گیا۔ حالانکہ
نواب صوف خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن مرحوم کے بعد ہمیشہ اُنھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے
ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں ہیں بلکہ انصاف اور
حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جسکے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا مرزا کی ذات میں دکھانا
مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی اُن کا اپنے فن میں ترقی
کرنا ناممکن ہے۔

حالانکہ اپشیائی شاعری جسکی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے۔ مرزا کی رگ و پے میں

سرایت کر گئی تھی باوجود اسکے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لئے جو شخص اُنکے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُسکو دیکھکر واپس بھیجدونگا۔ اُنھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے۔ اُن کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپیے کی! سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو، تمکو مبارک رہے، مجھکو مستعار دو، میں اُسکو دیکھ لوں، جو میرے پاس نہیں ہے اُسکی نقل کر لوں، پھر تم کو واپس بھیجدوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اسکی ہے کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھکو آزردہ اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ باللہ واللہ میں اُسمیں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیجدونگا۔ اگر تمکو واپس نہ دوں تو مجھپر لعنت، اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تمکو آفریں"

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں

"بدست مرگ ولے بدتر از گمان تونیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا، مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون کونسی رباعیاں مانگتے ہو، پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج، معنی اسکے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی

قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اُستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں سو

برہا نم کہ ہستیم وہمساں خواہد بود"

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں بھی کرتے تھے۔ پس اگر اُن میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا؛ مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے

وہ اس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی اُنھوں نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں جابجا شکایت کی ہے ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے؛ اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھکر لے گیا تھا؛ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو" اسکے بعد نوابصاحب اور مرزا زمانے کی نا قدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔

مہر نیمروز میں اس مضمون کو کہ میں نے اپنا کمالِ شاعری محض نا قدر دانوں کی مدح سرائی میں صرف کیا وہ ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں "سینۂ من نفسے داشت بروانِ آسائی نسیمے کہ از نسترن زار وزد؛ زیاں زدہ۔ من۔ کہ دم جز بہ نابالیست نہ زدم۔ زبانِ مرا طلبے بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد؛ بیہدہ کوش۔ من۔ کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم" یہی وجہ تھی کہ جب حسنِ اتفاق سے اُن کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اُسکو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر تخلص۔ جو ایک زمانے میں کول میں سر رشتہ دار تھے، اور جنکی سخن فہمی اور سخن سنجی کی

بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے۔ کیس وہ دلّی میں آئے ہیں؛ اور مرزا کے مکان پر ٹھیرے ہیں اُن کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جسکا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بکیسی اور تنہائی پر رحم کیا؛ اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم، اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا؛ اور جسنے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُسنے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں مَیں نے اپنے کلام کی خوبی۔ جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے؛ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں؛ مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؛ اور سخن فہم کسکو کہتے ہیں؛ مشہور ہے کہ خدا نے حُسن کے دو حصے کئے؛ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بےفکر ہوں؛ اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔

مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے بآسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی تو وہ اِس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئیگا؛ بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اِس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سید الشہداؑ کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُنکی بہت تعظیم کرتے تھے اور اُنکے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ

اِس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا، اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جسکو اور لوگ حدکمال تک پہنچا چکے تھے، اور قوسے میں انحطاط شروع ہوگیا تھا؛ بمشکل سے مسدس کے تین بند لکھے جنمیں سے پہلا بند ہمکو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو

اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی

اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھکر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیجدیے، اور صاف لکھ بھیجا کہ "تین بند صرف امتثال امر کے لئے لکھے ہیں، ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں؛ یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں، مجھکو اُن کے درجے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے"، اُن کا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آیندہ ہوگا۔

بعض اوقات ایسی فرمایشوں سے جنکے سرانجام کرنے میں اُن کو دقت اُٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے۔ یہ بات معلوم ہے کہ مادۂ تاریخ نکالنے سے وہ ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ایک بار نواب علاؤالدین خاں مرحوم نے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اُسکے تاریخی نام کی فرمائش کی اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے جب جوان ہوجاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہوگئے، حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو، ولادتِ فرزند کی

تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو؟ کہ مجھ پیر غمزدہ دل مُردہ کو تکلیف دو۔ علاؤالدین خاں!
تیری جان کی قسم!! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا؛ مجھکو اس وہم
نے گھیرا ہے کہ وہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں؛ نصیرالدین حیدر، اور
امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے؛
پھر نہ سنبھل سکے۔ جسکی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب
دُہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈھونگا۔

باوجودیکہ مرزا کی تمام عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گذری، اور اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مدح و
ستائش کا صلہ اُن کو کچھ نہیں ملا، اور جو محنت اور کاوش اُن کو قصیدوں کی ترتیب میں کرنی پڑی
وہ سب رائگاں گئی؛ مگر اُنھوں نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ کبھی نہیں لکھا۔ صرف ایک قطعہ
جو مرزا کے مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہے۔ ہمکو اُن کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے۔ جو
میرے دوست اور مرزا صاحب کے عزیز شاگرد لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے اِس کتاب کے
لکھتے وقت میرے پاس بھیجے ہیں۔ اِس قطعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک امیر کی
مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے، اور اُسکا جواب مدتِ دراز تک
مرزا کو نہیں ملا؛ تب مرزا نے بطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے۔ جسکو شکل سے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے؛
چونکہ اِس قطعہ کا مضمون لطف سے خالی نہیں اِس لئے ہم اوّل اُسکا خلاصہ اُردو زبان میں لکھتے ہیں؛
اسکے بعد قطعہ بجنسہ نقل کیا جائیگا۔

قطعہ کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں نے ایسا اور ایسا قصیدہ نواب کی خدمت میں

بھیجا تھا، اور اُسکے ساتھ عرضداشت بھی گذرانی تھی، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ کیا نواب مجھسے آزردہ ہو گیا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا لکھدیا ہوگا جس پر نواب کو آزردگی ہوئی۔ عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے! نواب جس ساز و ساماں کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہو سکتا۔ اُسنے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے سانڈنی، اصفہاں سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کر کے لائیں، تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ ساری ڈھیل اس وجہ سے ہے تو اُسکو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ جب عقل نے مجھکو یہ دم دیا تو میری تمام یاس و ناامیدی امید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لئے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اُسکے لئے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیماں سے، جامِ جمشید عالمِ غیب سے، آبِ حیواں چشمۂ خضر سے، عمرِ ابد، نشاطِ جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں''

قطعہ

گفتم بخرد بخلوتِ اُنس	کاے شمع و چراغِ ہفت ایواں
آیا زچہ رُو بود کہ نواب	ننوشت جوابِ نامہ ام - ہاں!
آں گونہ عریضۂ کہ دانی	درویش نوشتہ سوے سلطاں
آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی	از صفحہ دمیدہ سُنبلستاں

ایں ہر دو رسید و نیست پیدا | زاں سو اثرے بہیچ عنواں
رنجید مگر ز مدح نوّاب | اے کاش نہ گشتمے ثناخواں
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم | از گفتۂ خویشتن پشیماں
عقلم بجواب گفت "غالب! | زنہار مخور فریبِ شیطاں
نوّاب بفکرِ ارمغان است | تا نامہ فرستدت بساماں
وانہا کہ بخاطرش گذشتہ است | زود آں ہمہ جمع کرد نتواں
زود ست کہ جمع نیز گردد | دیر ست کہ دادہ است فرماں
تا راہروانِ بجہد و برگرد | آرند بکوشش فراواں
دیبا ز دمشق و مخمل از روم | الماس ز معدن و زر از کاں
فیل از دکن و زمرد از کوہ | توسن ز عراق و دُر ز عُماں
فیروزۂ نغز از نشاپور | یاقوتِ گزیدہ از بدخشاں
جمازۂ تیز رو ز بغداد | شمشیرِ بُرندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر | زربفتِ گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں روست | بر رنج و ملال نیست برہاں
چوں پیرِ خرد بدلنوازی | گفت ایں ہمہ رازہاے پنہاں
گشتم بدمِ امیدواری | مرہم بہ زخمِ یاس و حرماں
گفتم کہ چو با من ایں کرم کرد | آں قبلۂ و قبلہ گاہِ اعیاں

تاچار ز راہ حق گذاری	تا گردہ شود تلافی آں
من نیز طلب کنم برایشس	ایں خواہش اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر	انگشتر و تخت از سلیماں
از عالمِ غیب جامِ جمشید	از چشمۂ خضر آبِ حیواں
عمر ابد و نشاطِ جاوید	نیروے دل و ثباتِ ایماں
توفیقِ جوابِ نامۂ خویشس	توقیعِ عطا و بذل و احساں

مرزا کی بی بی - جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں - وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزہ کی سخت پابند تھیں۔ جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالاک تھے اُسی قدر اُن کی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں؛ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے۔ بایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمتگذاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر اُنکے کھانے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقتِ معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے۔ اور بی بی اور اُن کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اپنی جان سے بڑھکر اُن کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُنکی گھٹی میں پڑی تھی اُنکی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا، اور اُسمیں یہ بھی

کہ اُسکے ننھے ننھے بچے ہیں؛ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "امراؤ سنگھ کے حال پر اُسکے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ!! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُنکی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے" وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جدا یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں مُنہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھکر کہا "میاں مٹھو! نہ تمھارے جورو نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو؟

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھکر آئے؛ اُسکا دیوانخانہ تو پسند آگیا، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اُسکے دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھکر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا اُسمیں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے؟

یہاں مرزا کا ایک قطعہ اور ایک رباعی مقتضائے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے

گیرم کہ در روزِ حشر جوں تو بہشتی ... برسرِ دوزخ نشند تیرہ نشیمن
لیک نباشد دراں مضیقِ مصیبت ... در طلبِ نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نباشد دراں مقام صعوبت ... شورِ تقاضائے ناروائے مہاجن

اے آنکہ براہِ کعبہ روئے داری ... دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیرا کہ بتندی خرامی - دانم ... در خانہ زنے ستیزہ خوئے داری

مرزا شوخیِ طبع کے ہاتھ سے مجبور تھے، اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔

مرزا الٰہی بخش خاں معروف - جنکے تقدس اور بزرگی کے سبب اُنکے بڑے بھائی زانوے ادب تہ کرکے اُنکے سامنے بیٹھتے تھے، اور جو مرزا کے خسر ہونے کے سبب اُنکے قبلہ و کعبہ تھے - اُن کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے - وہ لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے، اور جب بہت سے مرید ہو جاتے تھے تو اُن کو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے - اُنھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اسکی نقل کر دو - آپ نے شجرہ کی نقل اِس طرح کی کہ ایک نام لکھدیا دوسرا حذف کر دیا تیسرا پھر لکھدیا چوتھا پھر ساقط - غرضکہ اسیطرح بہت سے حذف و اسقاط کرکے نقل اور اصل جا کر اُنکے حوالے کی - وہ دیکھکر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا ؟ مرزا نے کہا حضرت ! آپ اس کا کچھ خیال نفرمایئے ؛ شجرہ در اصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے ؛ سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دیجائے تو چنداں حرج واقع نہیں ہوتا؛ آدمی ذرا اُچک اُچک کر اوپر چڑھ سکتا ہے - وہ سُنکر بہت چِز بِز ہوئے، اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اُسکی نقل کرائی؛ اور مرزا ہمیشہ کے لئے اِس تکلیف سے چھوٹ گئے -

مرزا یا تو اس وجہ سے کہ اُن کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گذری تھی، اور یا اس لئے کہ اُن پر ناملائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا؛ آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے - ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اِس سال ضرور مر جاؤنگا -

۱۲۷۷ ہجری میں اُنھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ "غالب مُرد" اِس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے - منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے اُن سے مرزا صاحب نے اِس مادے کا ذکر کیا - اُنھوں نے کہا حضرت ! انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا - مرزا نے کہا

"دیکھو صاحب تم ایسی فال مُنہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادّہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا"

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے تو تف بریں وبا! اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اور حکایتیں اُن سے منقول ہیں۔ جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

مرنے سے کئی کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو پردہ ہو جاتا تھا آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا، چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا، اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا، ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا۔ مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر۔ یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے، یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوگا اُس سے شاید ایک دن پہلے میں اُنکی عیادت کو گیا تھا، اُسوقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاؤ الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا، اُسکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" اور شعر کا

پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا دوسرا مصرع یہ تھا "دنگرو ہجر یار این سر تو سلامت" مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر
وردِ زباں رہتا تھا "دم واپسیں بر سر راہ ہے ٭ عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے"

وفات

آخر ۔ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں
دنیا سے رحلت کی، اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائینِ مزار دفن کئے گئے۔
انکی وفات کی تاریخیں جو بہت سے ہندوستان کے اردو اخباروں میں چھپتی رہیں وگنتی اور شمار سے باہر ہیں، صرف
ایک تاریخ جسمیں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا - یاد رکھنے کے قابل ہے (یعنی آہ غالب بمرد) جسکو مختلف لوگوں نے
مختلف طور پر قطعات میں منظم کیا تھا۔ تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک، میر مہدی حسین مجروح، اور مؤلف
کتاب ہٰذا نے اردو میں اور منشی ہرگوپال تفتہ نے فارسی میں، مرزا کے مرثیے بھی لکھے تھے۔ جو اسی زمانہ میں چھپکر شائع ہوگئے تھے۔

نماز جنازہ

مرزا کے جنازے پر جب کہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی - راقم بھی موجود تھا، اور شہر کے اکثر عمائد اور
ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفےٰ خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم، اور سب سے
اہلِ سنت اور امامیہ دونو فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان ہیرہ نجف
محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ. مرزا صاحب شیعہ تھے، ہمکو اجازت ہو کہ ہم
اپنے طریقے کے موافق انکی تجہیز وتکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا، اور تمام مراسم اہلِ سنت کے
موافق ادا کئے گئے؛ اسمیں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ انکے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں
ہوسکتا تھا، مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنی دونو ملکر یا علیحدہ علیحدہ انکے جنازے کی نماز پڑھتے اور جسطرح زندگی
میں انکا برتاؤ سنی اور شیعہ دونو کے ساتھ یکساں رہا تھا اسیطرح مرنیکے بعد بھی دونو فرقے انکی حق گزاری میں شریک رہتے

شاگرد

مرزا صاحب کے شاگرد اطراف ہندوستان میں بیشمار تھے۔ انکی وسعتِ اخلاق اور عام رضا جوئی

یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ جو شخص اصلاح کے لئے اُنکے پاس غزل بھیجتا تھا ممکن نہ تھا کہ وہ اُسکے خط کا جواب اور اُسکی غزل میں اصلاح دیکر نہ بھیجیں۔ اگرچہ مرزا کی عظمت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اِس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اِس مضمون کیطرف اشارہ کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجو ۔۔۔ سایہ ہمچون دود بالا میرود از بالِ ما

با اینہمہ اہلِ دہلی و نواحِ دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیضِ صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے اُنکے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے؛ جیسے نیر رخشان، عارف، سالک، مجروح، علائی، تفتہ وغیرہم۔ اِنکے سوا خاص اہلِ دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عُرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت اُنکے شاگردِ معنوی تھے؛ جیسے نواب مصطفٰے خاں مرحوم جنھوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اُردو مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سید غلام علیخاں[1] مرحوم متخلص بہ وحشت جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور اُنکی صحبت سے مستفیض رہے تھے۔ مرزا نے اِنھیں دونو صاحبوں کی طرف اپنی ایک اُردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے

---

[1] یہ صاحب دلی کے ممتاز لوگوں میں تھے اُنکے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے قطع نظر علم و فضل کے اُردو اور فارسی دونو زبانوں میں نہایت خوش بیاں اور شعر کا مذاق اعلےٰ درجے کا رکھتے تھے اول سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر الور میں فوجدار ہو گئے پھر لکھنؤ میں نواب سعید الدولہ مرحوم نائب وزیر کے توسل سے کہ اُن سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے ایک معزز خدمت پر ممتاز ہو گئے وہاں سے پھر الور چلے آئے تھے اور عمر تک وہیں رہے غدر کے بعد اخیر عمر تک سررشتۂ تعلیم میں منسلک رہے اور نواب مصطفٰے خاں مرحوم اُنکی ہر حال میں مدد کرتے رہے ۱۲

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید   مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں"

یہ دونو صاحب باہدگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے ؛ یہاں تک کہ اُنکی دوستی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی ۔ ایک دفعہ جبکہ راقم بھی جہانگیر آباد میں موجود تھا سید غلام علی خاں مرحوم نوابصاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُن کا یہاں آنا سن لیا تھا ۔ اُنھیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے نام آیا ۔ اُسمیں خاں صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اِسطرح بدل کر لکھا تھا

"چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر حریفان بادہ پیما را"

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سُنکر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطف نہ تھا جیسا کہ اِس موقع پر مرزا صاحب کے اِس تصرف سے اُسمیں لطف† پیدا ہو گیا ۔

مرزا صاحب کے اُن شاگردوں کا حال جنکے نام کے بہت سے خطوط اُردوے معلّیٰ اور عود ہندی میں مرزا کے لکھے ہوے موجود ہیں یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں ؛ اس لئے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اس مقام پر لکھتے ہیں ایک نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور دوسرے نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کہ غالباً اِن دونو بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اُردو مکاتبات میں نہیں ہے جسمیں سے اُن کی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص و عام کو معلوم ہو

نواب ضیاء الدین احمد خاں ۔ جو فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے ۔ قطع نظر کمال شاعری و انشا پردازی کے تاریخ ، جغرافیہ ، علم انساب ، علم اسماے رجال تحقیقِ لغا

† یعنی نوابصاحب چونکہ شراب سے مجتنب تھے اور مرزا صاحب پیتے تھے اس لئے اُنکی نسبت چاے پیمائی اور اپنی نسبت بادہ پیما کا لفظ کہا ۔

اور جنرل انفورمیشن (عام واقفیت) میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے نمونۃً کوئی مستقل تصنیف اپنے نام سے نہیں چھوڑی، لیکن اکثر مصنفین اُن سے مدد لیتے تھے اور جو مشکل پیش آتی تھی اُسمیں اُن سے مشورہ کرتے تھے؛ خصوصاً الیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے اُسکی تصنیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی تھی جسکا مصنف نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں خود اعتراف کیا ہے۔

چونکہ نواب ممدوح اہلِ کمال کے عاشق تھے اور خاصکر مرزا صاحب سے اُنکی حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں اس لئے مرزا کے ساتھ اُنکو خاص تعلق تھا۔ وہ فارسی اور اردو دونو زبانوں میں فکر شعر کرتے تھے؛ مگر زیادہ تر فارسی نظم و نثر لکھتے تھے اور مرزا کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جسمیں اُنکا اُستاد ہونے پر فخر کیا ہے اُسکے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کرکے یہاں لکھے جاتے ہیں

صد آفتاب تواں ساختن ببازیچہ	ز ذرہ کہ بود در ضیاے نیرِ من
نہ ایں سپہر و نہ ایں مہر عالمے دگرست	من آسمانم و او مہرِ نور گسترِ من
من آں سپہر کہ وام۔ چنانکہ مہر بماہ	بہ مہر نور دہد نیستہ منورِ من
من آں سپہر کہ ہر دم رسد عطیہ فیض	بہ سعدِ اکبرِ گردوں ز سعدِ اصغرِ من
منم خزینۂ راز و درِ خزینۂ راز	ضیاے دینِ محمد کہیں برادرِ من
بدین و دانش و دولت یگانۂ آفاق	بعمر کمتر و از روے رتبہ مہترِ من
بہ مہر دل بہ برادر دہم۔ نہ یعقوبم	کہ بود خویش بود دلستان و دلبرِ من

سخن سرائے تو آئین نوائے را نازم
بنالہ ہمنفسِ من بہ شورِ ہمسرِ من

بہ نکتہ شیوۂ شاگردیِ من بہ من ماناست
صنم بصورتِ خود مے تراشد آزرِ من

اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم
بود بپایہ ارسطوئے من سکندرِ من

زمینِ کوئے مرا آسماں کند ہر صبح
طلوعِ نیّرِ رویش ز طرفِ منظرِ من

اگر شوم بہ مثل آتشے شرارہ فشاں
شود بقاعدۂ ہمدمی سمندرِ من

بہ بحر گر فتدم رہ - بود سفینۂ من
بہ تخت گر بودم رای - گردد افسرِ من

بہ مہرِ دوست و ہم دل - نشاطِ خاطرِ من
بہ کینِ خصم نہم رخ تو اے لشکرِ من

گرم ز غصہ تبہ گشتہ کار - مونسِ من
ورم ز کار فرو ماندہ دست - یاورِ من

زہے ز روئے تو پیدا فروغِ دانش و داد
بدیں فروغ - جہانتاب گشتہ اخترِ من

ز تو کہ آئنۂ فیضِ صحبتِ اُوئی
ہوائے دیدنِ غالب فتادہ در سرِ من

مرا ستودی و گفتی کہ من از آنِ توام
فدائے آنِ تو بادا اقل و اکثرِ من

سعادت و شرف چون منے بعرضِ کمال
نہ بس بود کہ بود چوں توئے ثناگرِ من!

نواب محمد مصطفیٰ خاں

نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انھیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے لیکن خانِ موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں ہمیشہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہو تو مرزا کے بعد اُنکے معاصرین

لہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے مرزا کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا تھا جسکی طرف ان دونو بیتوں میں اشارہ ہے ۱۲

کسی کی فارسی غزل اُنکی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی اور شعر کا جیسا صحیح مذاق اُنکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے لوگ اُنکے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے ۔ اُنکے سکوت سے شاعر کا شعر خود اُسکی نظر سے گر جاتا تھا اور اُن کی تحسین سے اُسکی قدر بڑھ جاتی تھی ۔ یہی وہ شخص تھے جنکی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او ۔۔۔ ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد
یعنی پسند نکرد ۱۲

نواب ممدوح کی شان میں بھی مرزا کا ایک فارسی قصیدہ اُنکے دیوان میں موجود ہے جس میں اوّل فخریہ تشبیب لکھی ہے فخریہ اشعار لکھتے لکھتے کہتے ہیں

دست رد بر تاجِ قیصر مے نہم ۔۔۔ پشت پا بر تخت خاقاں مے زنم
خردہ مے گیرند بر من قدسیاں ۔۔۔ گر نفس در مدحِ سلطاں مے زنم
آں ہمائے تیز پروازم کہ بال ۔۔۔ در ہوائے مصطفےٰ خاں مے زنم
عرفی و خاقانیش فرماں پذیر ۔۔۔ سکہ در شیراز و شرواں مے زنم
او خرام مست و من چاؤش وار ۔۔۔ بانگ بر اجرام و ارکاں مے زنم
گلشنِ کوئیش گذرگاہ من ست ۔۔۔ دوش در رفتن برضواں مے زنم
خوبیِ خوئیش بد آموزِ من ست ۔۔۔ دم ز یاری مے زنم ہاں مے زنم
مہر ورزی ہیں کہ باشم ہمنشیں ۔۔۔ من کہ زانو پیشِ دریاں مے زنم
بشنود بے آنکہ باد آں را برد ۔۔۔ نالہ گر در کنجِ زنداں مے زنم
بنگرد بے آنکہ کلک آں را کشد ۔۔۔ نقش گر بر صفحۂ جاں مے زنم

دوسرا حصہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اُسکا انتخاب

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی - ایک ایسے زمانے میں جبکہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مُردہ زبان کے ہوگئی ہے اور ذوقِ شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے - ایک نہایت مشکل کام ہے مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ اُنکی فارسی نظم و نثر ہے. لیکن اول تو فارسی زبان سے مُلک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے؛ دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا ہیں. پس جو شخص اس زمانے میں اُن کے کلام پر ریویو کر اور اُسکے ذریعے سے مصنف کی حقیقت اور اُسکا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ در حقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جسمیں کامیابی کی بہت ہی کم امید ہو سکتی ہے. لیکن اگر کچھ ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جاے؛ نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کرکے اُس سے ہاتھ اُٹھا لیا جاے.

دفعِ غم نیست جز بعشق خوردن چارۂ کار نیست جز جبر کردن

(مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ انکی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے۔ جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر[1] کہنا شروع کر دیا تھا؛ اُسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کئے تھے؛ جنکی ردیف میں کہ چہ بجائے یعنی چہ کے استعمال کیا تھا۔ جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظم کو سُنائے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؛ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سُنکر خاموش ہو رہے۔ ایک روز مُلّا ظہوری کے کلام میں ایک شعر اُنکی نظر پڑ گیا جسکے آخر میں لفظ کہ چہ یعنی چہ کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے اُستاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا شیخ معظم اُسکو دیکھکر حیران ہو گئے؛ اور مرزا سے کہا تمکو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے؛ تم ضرور فکر شعر کیا کرو؛ اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

مرزا کو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربی و سرپرست اُنکے سر پر نہ رہا تھا۔ مرزا کی ننھیال جہاں اُنھوں نے

---

[1] منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہمعصر تھے ایکبار دلّی میں آئے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثناے کلام میں اُنکو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے بیان میں لکھی تھی وہ بھی آپکو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اُسکو دیکھکر بہت خوش ہوئے اُسکے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔ "رشتہ در گردنم افگندہ دوست ÷ مے کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست" لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی ۱۲

پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی اور ننھیال کی ثروت سے ظاہرا مرزا اور اُنکے بھائی سے بڑھکر کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہ تھا۔ آغاز شباب میں جبکہ سر پر کوئی مربی نہو۔ دولت و آسودگی سے زیادہ کوئی چیز فانہ برانداز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گذری ہے اُسکی کیفیت کا خود اُنھیں کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اس طرح ظاہر کرتے ہیں "با فرو فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگان ہمنشیں، و با اوباش ہمرنگ، پا بے بیراہہ پوے، و زباں بے صرفہ گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار"، اسکے بعد لکھتے ہیں "تیزی رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد"، الغرض مرزا کا لڑکپن اور اُنکی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جسکا نہ کوئی قدرداں نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلےٰ درجے کا کمال بہم پہونچانا تو درکنار، اُس کا خیال بھی دل میں گذرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف اُنکی طبیعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بے خبری کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

مرزا نے گُلِ رعنا[1] کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا اس لئے ہم بھی پہلے اُنکے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر

[1] مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمایش سے اپنے تمام اُردو اور فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جس کا دیباچہ اُنکے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے اُسکا نام گُلِ رعنا رکھا تھا۔

کہنا شروع کیا تھا۔ قطع نظر اسکے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر[†] تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اِس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُسنے اسکو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بنجائیگا؛ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ۔ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر مُلا عبد الصمد کی تعلیم کے سبب۔ فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُنکی قوتِ متخیلہ پر چڑھگیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

"طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے"

یہاں بطور نمونہ کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

(۱) کرے[*] گر فکرِ تعمیرِ خرابیہائے دل گردوں — نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالبہا

[†] مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی مرزا کے اشعار اُنکے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے۔

[*] یہ شعر مرزا نے اپنے دیوانِ ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوان فارسی میں تغیرِ الفاظ داخل کر دیا یعنی اس طرح "کند گر فکر تعمیرِ خرابیہا گردوں؛ نیاید خشت مثل استخواں بیروں ز قالبہا"

(۲) اسد ہر اشک ہے اک حلقہ بر زنجیر افزودن | بہ بندِ گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا
(۳) بحسرتگاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں | خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے ترجبیں پایا
(۴) رکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ | اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا
(۵) پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش | خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا
(۶) موسمِ گل میں مے گلگوں حلالِ میکشاں | عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہر دانہ تھا
(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا | گو ئیا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

چونکہ مذکورۂ بالا شعروں میں۔ قطع نظر اسکے کہ طرزِ بیان اردو بول چال کے خلاف ہے۔ خیال میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی؛ اِس لئے اِن کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطور نمونے کے شرح کیجاتی ہے؛ تاکہ معلوم ہو مرزا نے مشقِ سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اُس سے ہمیشہ ہمکو دور رکھا۔ اگر غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لئے ہر ایک ناخن۔ جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو کا کام تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ دیا کرنا؛ اور ناخنِ بُریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی طرف اشارہ کرتا تھا؛ کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذت اور راحت حاصل ہو

یہ اوپر کی سات بیتیں ہمنے مرزا کے اُن نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی جو انھوں نے اپنے دیوانِ ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اُسمیں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اِ

اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہوسکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جو اَب دیوان میں موجود ہیں۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

اِن اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اسمیں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کئے ہونگے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دُکھا ہوگا؟ ظاہراً یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار۔ جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے۔ اُنکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار اُنکی نظر میں کھٹکے ہوں؛ مگر چونکہ دیوان چھپکر شائع ہوچکا تھا اس لئے اُنھوں نے اِن اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شقیں اُنکے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اوّل اوّل ایسے رستے پر پڑ لئے تھے کہ اگر استقامتِ طبع، اور سلامت ذہن، اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، اور نکتہ چین ہمعصروں کی خُردہ گیری اور طعن و تعریض سدِ راہ نہوتی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دُور جا پڑتے۔ سُنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی [illegible]

میں۔ جہاں مرزا بھی ہوتے تھے۔ تعریضاً ایسی غزلیں لکھکر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے توبہت پُرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں؛ مگر معنی ندارد؛ گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے؛

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رام پوری نے۔ جو نہایت ظریف الطبع تھے۔ اور جنکو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا۔ مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا؛ اور اُسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے مرزا کے سامنے پڑھے

"پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال   پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال"

مرزا سنکر سخت حیران ہوئے؛ اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے؛ اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھپر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں؛ اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں

"نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے

"گر خامشی سے فائدہ اخفای حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے"

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی

خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے؛ کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرۃً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اِس لئے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے اُنکو بہت تنبہ ہوتا تھا؛ اور آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اِسکے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُنکو اپنا خاص مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو اُنھوں نے اِس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی؛ یہاں تک کہ اُنھیں کی تحریک سے اُنھوں نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا؛ اور اُسکے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہوسکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سُننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے اُنھیں کو جب اہلِ زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو اُنکو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ اِدھر قائل کے مُنہ سے نکلا اور اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا؛ مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی (جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی) فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروفِ ربط اور توابع فعل۔ جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اُنکو مرزا اُردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جاے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہوجاے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے

جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً اُنکے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے

"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے"

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو؛ معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری - جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ - اور بلبل - جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں - اُنکے جگرسوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُنکے چہکنے اور کوکنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہراً یہ انھیں کا اختراع ہے ایک شخص نے یہ معنی سُنکر کہا کہ "اگر وہ اے کی جگہ جز کا لفظ رکھدیتے یا دوسرا مصرعہ اِسطرح کہتے "اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے" تو مطلب صاف ہوجاتا" اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تابقدور بچتے تھے اور شارعِ عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اِس لیے وہ بہ نسبت اِسکے کہ شعر عام فہم ہوجائے اِس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اسمیں شک نہیں کہ اِس سے اُنکی اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطرخواہ سُراغ ملتا ہے اور یہی اُنکی ٹیڑھی ترچھی چالیں اُنکی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگ ڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کرکے گلّے کے پیچھے پیچھے ہولیں؛ اور لیک سے ادھر اُدھر آنکھ اُٹھاکر نہ دیکھیں جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُسمیں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِمو تجاوز

نہ کریں، اور اُنکے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے
ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُنکی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اِسکے جنکی طبیعت میں اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک
ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر اُنکو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ اُنکو قوم کی شاہ راہ کے سوا
بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں
اُسپر چلنے سے اُنکی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں و منزلِ مقصود
تک پہنچانے والا نہو، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں
نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہو جائیں عام رہگیروں کی طرح آنکھیں بند کرکے شارعِ عام پر پڑجائیں؛
مرزا کی طبیعت اِسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔
وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات
سے جہاں تک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

لطیفہ

ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلّی میں آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی اُنکے
سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے؟ اُنھوں نے میر امانی
متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا

"اسد اِس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی"

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سنکر بہت جزبز ہوئے
اور فرمایا اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اُسکو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔

مرزا کو اِس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اسلیئے ناگوار گذرا ہوگا کہ مرے شیر اور رحمت خدا کی یہ دو نو محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں؛ اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا بھی اُنکی طبیعت کے خلاف تھا؛ کیونکہ وہ ایسی مبتذل عایتوں کو جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جایں - مبتذل جانتے تھے۔

اِس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ وضع میں، لباس میں، طعام میں، طریق ماندو بود میں، یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نکرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے۔

مرنے سے آٹھ سات برس پہلے اُنھوں نے ایک مادۂ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا - جس میں ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اُسی سال شہر میں وبا آئی؛ مگر مرزا بچ گئے۔ اِس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اسی سنہ میں مجھے مرنا چاہیئے تھا) مگر میں نے وباے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا؛ واقعی اسمیں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جاویگا" اگرچہ اِسمیں ایک ہنسی کی بات لکھی ہے؛ مگر اُنکی طبیعت کا اقتضا اِس سے صاف جھلکتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جسکو یہ خط لکھا ہے وہ اُنکی اِس خصلت سے خوب واقف ہے۔

بہرحال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے۔ اور استقامتِ طبع اور سلامتیِ ذہن نے اُنکو راہِ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔ گو اُن کا ابتدائی کلام جسکو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہوا؛ مگر چونکہ قوتِ متخیلہ سے

بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اس لئے اُسمیں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی۔ جب قوتِ ممیزہ نے اُسکی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُسنے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا؛ بلکہ محض تفننِ طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُمنگ سے، کبھی دوستوں کی فرمائش سے، اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے، ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتد بہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو؛ اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہیکو ہیں؛ پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا۔ اب قدردانی اِس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرتِ ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہکر لیجاتا ہوں"

قطع نظر اِسکے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اُسی میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اُسمیں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں

"فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است"
"راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید — ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است"

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اِس لئے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اُسکے کلام کے رتبہ کا اندازہ اُسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا؛ بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اِس لئے نہیں کرتے کہ اُنسے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں؛ بلکہ صرف اُسکے منتخب اشعار نے۔ جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں۔ اُسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔

لطف علیخاں آذر آتشکدہ میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اُسکے دیوان کا مختصر ہونا بھی اُسکے کلام کی خوبی اور حسنِ طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام یکساں معیار سے نہیں جانچا جاتا؛ ورنہ فردوسی و نظامی دونوں مثنوی میں، اور انوری و خاقانی دونوں قصیدے میں، مسلّم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے؛ حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رُکنِ رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اُردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلوں میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔

جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہمکو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لئے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑیگا، جسکو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کرینگے۔

میر و سودا اور اُنکے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے۔ کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اوّلاً فارسی اور اُسکے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیلِ الفاظ اور بتغیرِ اسالیب بیان عامۂ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کئے جایں۔ چنانچہ میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گذرے ہیں اُنکی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اِس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ اُنکی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جاے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔

برخلاف اِسکے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ اُنکی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جنکو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا۔ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے؛ اور اُن میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرِ مو انحراف نہیں کیا؛ اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اُسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اوّل شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا؛ اور جب راہ کی مشکلات نے

مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اُسی رُخ چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اُسکے سوا ایک اور
لیک اُسی کے متوازی اپنے لئے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑ کر
دوسری چال اختیار کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور اُن کے مقلدین کے
کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اُسکے بعد
مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اُسمیں ہمکو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے؛ اور جس
طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل
نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے؛ اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا
ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے اُنکے خیالات
کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے

"بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے؛ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال
ہے دعوے یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو
عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے؛ بلکہ شاعرانہ
استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے
ایک نیا خیال ہے؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ

صرف اِس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبیعی
خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام
کرتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۔۔۔ ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے؛ اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی
ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو
کیا برائی ہوتی؛ مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا؛ مطلب
یہ کہ خدا ہوتا؛ کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ۔۔۔ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے۔
اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے۔ دعوےٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے
اُسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جسکو آنکھوں میں
جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا۔ موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اُسکو۔ جیسا کہ ظاہر ہے
یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ ۔۔۔ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو؛ مگر ہم نے آج تک
نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اِس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب

یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو۔ اس لئے کہ اسمیں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم اُسی کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات سے دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چارچند کر دیا ہے۔

فضیلت نوع انسانی

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اُسکے متحمل نہوئے، اور ڈر گئے، اور انسان نے اسکو اُٹھا لیا"، شاعر کہتا ہے کہ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہِ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھکر اُسکے موافق اُسکو شراب دی جاتی ہے، پس کوہ طور۔ جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اسمیں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

شوخی

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز   دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لئے پہلا مصرع اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے۔ جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دیجا چکی ہو۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے۔ جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ؛ اور در پردہ الزام دیتا ہے؛ گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں؟ وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب اُنکو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں، اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُنکی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اُسکو خاطر خواہ نہ کر سکا؛ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہوا؛ اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا۔ جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اُسپر خدا کا اس لئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں؛ کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؛ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہو، وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہوتی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی؛ پس خدا کا شکر ہے کہ اُسنے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے۔ جسکو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اِسکو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الورار ہے۔ کہتا ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے۔ اور اُسکو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے؛ اور اِس سے بہتر اس مضموں کے لئے مثال نہیں ہو سکتی۔

نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو ۔۔۔ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اُسکے زخم کی گہرائی اِس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اُس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی اُنکے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغہ کی معراج ہے۔ جس کی نظیر آجتک نہیں دیکھی گئی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ۔۔۔ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔

اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لیجاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونو صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہوتا۔ یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ دقت نہ تھی؛ کیونکہ ہم ہاتوں ہی کر

بیٹھ رہتے، اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے؛ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں؛ اور اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی.

وفاداری

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے	مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے، اور وہیں مر رہے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اُسکو کعبے میں دفن کیا جاے؛ کیونکہ اُسنے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کردیا؛ اور یہی ایمان کی اصل ہے.

تصوف

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ	دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی؛ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہئے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں.

حسن بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُسنے کہا	میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی کہ جو بات قائل کے مُنہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جاے کہ اُسکو یہ شبہہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی.

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا	جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اُسکی کچھ تعریف نہیں ہوسکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گذرا.

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے　　　بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو مگر تمثیل نے اسکو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھکر اُسکی طرف التفات نکرتے تو دنیا ویران ہو جاتی پس یہ جاننا چاہیئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں یعنی جسطرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اسمیں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید　　　ناامیدی اُسکی دیکھا چاہیئے

ناامیدی کی غایت اس سے بڑھکر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　　یارب اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہمنے کئے ہیں اگر انکی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور اُنکی حسرت دل میں رہ گئی اُنکی داد بھی ملنی چاہیئے۔

علاوہ جدتِ مضامین اور طرفگی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اَور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے اُن تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں اختراع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے، بلکہ خیالات کی جدت اُن کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اُن کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے،

نجومی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ جبال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالبِ خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں اُنکے ابتدائی ریختہ میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اُسی قدر تشبیہوں میں - باوجود ندرت اور طرفگی کے - سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام ۔۔۔ مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

یہاں سورج کو - اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں - چراغ رہگذرِ باد سے تشبیہ دی ہے؛ جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

دوسری جگہ اس لحاظ سے کہ حسنِ معشوق کے مقابلے میں اُسکو ناقص الخلقت قرار دیا ہے - ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ۔۔۔ خورشید ہنوز اُسکے برابر نہوا تھا

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اُسکو غم سے نجات نہیں ہوتی - شمع سے تشبیہ دی ہے؛ کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ۔۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

اس قسم کی بدیع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونو دیوان اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے ابتذال سے

بہت بچتے تھے۔ مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں جس قدر
اُنکے کلام میں کم ملینگی شاید کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں مثلاً صلِّ علیٰ کا
لفظ جو بجاے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اُسکو وہ کبھی جائز نہیں رکھتے تھے یہاں
تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے
اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں۔ اور خواص اُنکو
کبھی نہیں بولتے تا بمقدور وہ اُنکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام
کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہوجاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے وہ
فوت ہوجاتا ہے مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو، [illegible] جو لٹریچر کی جان اور
یعنی جو گناہ [illegible] اور جسکی طرف ریختہ گو شعرانے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتاً اپنے
[illegible] کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرانے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلا شبہہ
استعمال کیا ہے؛ لیکن استعارے کے قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے
اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کیجاتی ہیں۔

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یعنی اِس مطلب کو۔ کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اِس سے کیا تسلی ہو سکتی
ہے۔ اِسطرح ادا کیا ہے "بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا"

[*] مرزا کہتے تھے کہ حرفِ جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور جو اُسکے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اُسمیں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہوجاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے ان دو مصرعوں میں اُسکی تصویر کھینچدی ہے جس سے بہتر کسی اسلوبِ بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہوسکتا۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ   دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے   اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمکو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں   جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُسوقت اُنکے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں، مگر استعارے اور تمثیل نے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کردی ہے۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں، اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں، اور کیا نثر میں۔ باوجود سنجیدگی و متانت کے۔ شوخی و ظرافت ہے؛ جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گذرے ہیں؛ ایک سودا، دوسرے انشا؛ مگر دونو کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی؛ بخلاف مرزا غالب کے کہ اُنھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

۴۔ چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے؛ اور جسکو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے بعنکے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں؛ مگر غور کرنے کے بعد اسمیں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں؛ جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

مثال

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اِس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اِس قدر ویران ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر یاد آتا ہے؛ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اِس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھرہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہوگی؛ مگر دشت بھی اِسقدر ویراں ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

مثال ۲

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق　　　ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مے مردافگنِ عشق کا ساقی - یعنی معشوق - بار بار صلا دیتا ہے ؛ یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا ؛ اس لئے اسکو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد - جیساکہ مرزا خود بیان کرتے تھے - اسمیں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں ؛ اور اسی مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے ۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق" یعنی کوئی ہے جو مے مردافگنِ عشق کا حریف ہو ؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق" یعنی کوئی نہیں ہوتا ۔ اسمیں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے ۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے ؛ اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے ۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائینگے ۔

کیونکہ اُس بُت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اسکے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا ؛ اسلیے جان کو عزیز نہیں رکھتا ۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا عین ایمان ہے ؛ پھر اُس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے ۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری

نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اُسکو گوارا نہوتی ؛ اور یا اب ہمکو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اِس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصّے کی طرف اشارہ ہے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہے ؛ کہ جب خدا تعالےٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتون نے کہا "کیا تو دنیا میں اُس شخص - یعنی اُس نوع - کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اُسمیں فساد اور خونریزی کرے ؟ وہاں سے ارشاد ہوا کہ " تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں " اور پھر آدم سے اُنکو زک دلوائی ؛ اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔

مثال

ترے سرو قامت سے اِک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے ؛ اِسلیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔

مثال

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

اس شعر میں " ترے سر کی قسم ہے ہمکو " اِس جملے کے دو معنی ہیں ؛ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑائینگے۔ اور دوسرے یہ کہ ہمکو تیرے سر کی قسم ہے - یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائینگے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے - یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

مثال

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اِسکا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو ؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر

فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا   بس چپ رہو ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے" اسمیں دو معنی رکھتے ہیں؛ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تمکو قائل کردینگے؛ اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھکر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے   دیکھوں اب مرگئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

"کون اُٹھاتا ہے مجھے" اسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اُٹھاتا ہے؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے باد پیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اسمیں باد پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کردیے ہیں؛ باد پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں؛ پس ایک معنی تو اسکے یہ ہیں کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اسمیں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اِس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا؛ اور باد پیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے؛ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

مذکورۂ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابلِ ذکر ہے جو مرزا اور اُنکے بعض معاصریں ومتبعیں کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے۔ جو جذبات اور خیالات اہل ایران نے غزل کے پیرائے میں ظاہر کئے ہیں ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل اُنھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا۔ ضرور تھا کہ وہی انقلاب اُردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔

قدمائے اہل ایران جن کا دورہ مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے اُنکی غزل میں جو جذبات وخیالات بیان ہوئے ہیں وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے؛ اور گو اسالیبِ بیان میں تلاحق افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہو گئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لئے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے تو اُنکے لئے میدانِ غیر متناہی موجود تھا مگر اُنھوں نے اُس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا؛ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اُنھوں نے تو اُسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی؛ مگر جنکی فطرت میں اُرجنیلٹی اور اُپج کا مادہ تھا وہ اُنھیں قدیم خیالات وجذبات میں اپنے اپنے مبلغِ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر اور اُنکے اقران وامثال کی

غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں:
مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ — تو در طریقِ ادب باش و گو گناہِ من ست

نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لاکر اسمیں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے
وہ کہتا ہے۔

تا منفعل ز رنجشِ بے جا نہ بینمش — مے آرم اعترافِ گناہِ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

از عدالت نبود دور گرش پرسد حال — پادشاہے کہ بہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں- جو کہ اسکا ممدوح
بھی ہے اور محبوب بھی- ایک نئے انداز سے بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مروت کردہ شبہا بر تو سیرِ بام و دَر لازم — نمے باشد چراغی- خانۂ بے دستگاہاں را

یعنی چونکہ بے مقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا اس لئے مروت اور کرم نے تجھپر
لازم کر دیا ہے کہ راتوں کو کوٹھے پر چڑھکر ٹہلا کرے تاکہ تیرے چہرے کی روشنی سے انکے گھر
میں چاندنا ہو جائے۔ مطلب یہ کہ انکے حال سے واقف ہو کر انکی مدد کرے۔

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہوری میں آیا تھا کیونکہ نئی طرز اسوقت
تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہلِ فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں۔ لیکن ریختہ میں یہ
انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا، کیونکہ متاخرینِ اہلِ ایران کا نمونہ موجود تھا

اس لئے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اُسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی؛ کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مُدوّن ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اُسکے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اِسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اِس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلک سی نظر آجاتی ہے مگر اسمیں شک نہیں کہ اوّل مرزا نے اور اُنھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، سالک، عارف، داغ وغیرہم نے اِس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا۔ خصوصاً مومن خاں مرحوم اِس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اِس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کرکے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے۔ مثلاً میر تقی کا شعر ہے۔

میری تغییرِ رنگ پر مت جا ۔۔۔ اتفاقات ہیں زمانے کے

اِسی تغییرِ رنگ کے مضمون کو مومن خاں نے اِس طرح باندھا ہے۔

میری تغییرِ رنگ کو مت دیکھ ۔۔۔ تجھکو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رُخِ روشن کو شمع پر اِس طرح ترجیح دی ہے۔

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور ۔۔۔ شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خاں داغ نے اِسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں

رُخ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں ۔ اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں، غالب، مومن اور اُنکے متبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں ۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اِسلئے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اِسی قبیل کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں ۔ رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

نلا ہے جذبِ دل کا شکوہ - دیکھو جرم کسکا ہے ۔ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں ۔ آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

ضد کی ہے اور بات - مگر خو بُری نہیں ۔ بھولے سے اُسنے سیکڑوں وعدے وفا کئے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ۔ میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے

اُسکی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجور یہاں ۔ مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

نقش کو اُسکے - مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں ۔ کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے ۔ یہاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم ۔ لے لیا مجھسے مری ہمّتِ عالی نے مجھے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ۔ موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے جذبہ اور معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہتِ گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولے سے سیکڑوں

وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا، چھٹے میں دلِ رنجور کا نقش مرغِ غلیچے کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا مصوّر سے کھنچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمت عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود موت آنے کے موت نہ آنی، یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لیکر میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں، اور اگر تھیں تو صرف اُس قدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ اِس قسم کے تکلفات و نزاکتیں نظروں سے گر جائیں۔ لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گرانمایگی میں کچھ فرق نہیں آتا جنکو نئی طرز کے موجد ہونیکا فخر حاصل تھا۔

بہرحال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ، اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، سودا و درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہیے۔ قدما اُردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے۔ برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو

خط میں لکھتے ہیں کہ "بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے"

اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجایش ہے لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوان ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دئے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں اُن کو اب مکرر نہ لکھیں گے اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائینگے اور کہیں کہیں محاسن شعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائیگا

ستایشگر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

طاقِ نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھکر بھول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جس کو طاق میں رکھکر بھول جائیں۔ بیخودوں کے بہشت کو گلدستۂ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا
یہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے؛ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے ہیں، اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی؛ اور اسلئے اُسکے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا

حساب دینا پڑتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سنکر کہا "بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے" مرزا نے کہا "حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں"

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر　　رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھکر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خونِ بیگناہ اپنی گردن پر نہ لے مگر اب تیری گردن پر بجائے خونِ بیگنہ کے حق آشنائی کا رہیگا۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا　　مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غمِ فراق میں تکلیف سیرِ گل مت دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

خندۂ گل کو خندۂ بے جا اس لئے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھکر یا از راہِ تعجب نہیں ہنستا ، پس گویا اُسکا خندہ بے محل ہے ۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسد   جفا میں اُسکی ہے انداز کار فرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یاد آتا ہے ، کیونکہ فلک سے جو جفا سرزد ہوتی ہے اُسیکے حکم سے ہوتی ہے ۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں   گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اُسنے زبردستی کیوں نہ پلادی ؟

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا   بحر اگر بحر نہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگئ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے   کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق   آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جُرم کے ثبوت کے لئے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے ، صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں ۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم   میں معتقدِ فتنۂ محشر نہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلا اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلّہ تک نہیں بھیگا ۔ تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے ، اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی ۔ یہ بعینہ ویسی ہی بات ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سنکر اُسکی تعریف کرنے وقت کہا تھا کہ ، اسمیں مرزا

کیا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے،، غرضکہ ایک معصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کر دیتا ہے جس سے یا اُسکی تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف اُس سے بھی زیادہ نکلے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں　　شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اُسکا غیر سے اخلاص حیف　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشین تھا وہی سُنکر میرا رقیب بن گیا؛ کیونکہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی،، اور پھر بیاں اپنا،، یہ مرزا کی خصوصیات میں سے ہے۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے　　بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان نکلا؛ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہمکو ذلت دے ہم اُسکو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے؛ اور یہ ظاہر کرینگے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے؛ ہمارا اسکا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے

ثابت کی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم　　　تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یعنی اگر نالہ کی اجازت نہوگی تو ہم اُسکو ضبط کرینگے اور اُسکا اثر تجھ تک پہونچیگا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ　　　مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے فرو بہتر ہوگی اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں جسکا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے　　　شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل　　　جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعوے چل نہیں سکتا یہ شعر حقیقت و مجاز دونو پر محمول ہو سکتا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گذر جائیگا تو مر جائینگے یعنی فنا ہو جائینگے گویا قطرہ دریا میں کھپ جائیگا اور یہی اُسکا مقصود ہے پس درد کا حد سے گذر جانا یہی اُسکا دوا ہو جانا ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد　　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوا　　　باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال　　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا		روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب		یار لائے مِرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن		جانوں کسیکے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات		سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ		ہمکو حریصِ لذّتِ آزار دیکھکر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ		لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں		جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا		یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھینگے مری بات		دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اسمیں در پردہ اُن لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں		ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُسوقت تک راہِ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِ راہ ہے پس اگر ہمنے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے　　　رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نالے یعنی خود ہی نالے نہ آہ و نالے - مثال کس قدر مثل کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اُسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اُسوقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　　متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاعِ بُردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کریگا۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے　　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے، خواہ زن و فرزند کی محبت ہو خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی، خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اسکی مثال اُس انجمن کی ہے جسمیں شمع کی روشنی نہیں۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر　　　بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے، اور وطن کو گلخن سے، تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح پھونس ہوتا ہے تو جلتا ہے، اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اسکی کچھ قدر نہیں ہوتی، یہی حال میرا ہے، کہ وطن میں تھا

تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر۔ ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اُسکو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اُسکو اُس کام کے کرنے سے انکار ہے پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اُسکو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اسلئے نہیں کھا سکتا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاویگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کس مُنھ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

یہاں ہمزباں کے لفظ میں ایہام ہے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہوسکتی اور در پردہ اسمیں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ہر چند پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے دوسرے مصرع میں نئے رنگ سے کس خوبی کے ساتھ اس شعر میں سا[illegible] دشت نوردی کی مانع کوئی تدبیر نہ ہوئی اُسکو اس طرح ادا کرنا کہ پانو میں چکر ہے [illegible] زنجیر نہیں کمال بلاغت ہے۔

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جادہ یعنی بیٹا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اُس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اِس لئے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

الفتِ گل سے غلط ہے دعویِ وارستگی   سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود   قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلہ پر قبلہ نما کا اطلاق غالباً مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے   ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو، اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ   ہمکو جینے کی بھی امید نہیں

یہ شعر سہل و ممتنع ہے اِس زمین میں اِس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں   یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

یعنی آج اِس خوف سے شراب دینی کہ کل نہ ملیگی ساقیِ کوثر کی فیاضی پر سوءِ ظن کرنا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر   آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ... میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے، یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اسلئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا دور جام ... ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہونچی ہے" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے ایسا حذف۔ جسپر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ... لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے، یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اُسکا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف؛ اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اور اُسکے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف؛ اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرع بہم پہونچ گئے جن میں حسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے؛ مگر اُسکا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلآویز ہوتا ہے۔ اسیطرح

بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے، مگر اُسکا غصہ میں بگڑنا اُسکے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں؛ اسکی اصل خوبی وجدانی ہے جسکو صاحبِ ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے، اس لئے مرزا کا کلام سُنکر اکثر اُلجھتے تھے اور اُنکی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اُس روز اس شعر کو سُنکر وجد کرنے لگے اور متعجب ہوکر پوچھا کہ یہ کسکا شعر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے، اور اُس روز لاعلمی میں بے ساختہ اُنکے مُنہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سُنکر بطور مزاح کے جیسی کہ اُنکی عادت تھی فرمایا" ایسی مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے"، مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معنیً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہمکو معلوم ہے ایسا لطیف بیان آجتک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیئے تھمے ۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُسکے قابو سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے

اُتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ۔ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے - جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے - کیونکہ وہ وجودِ واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجودِ ماسوی کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں

رہتا ہوں اُتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجودِ واجب سے بُعد ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر   یہاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدت وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اصلح ادا کرنا کہ "یہاں کیا دھرا ہے،، نہایت بلاغت ہے۔

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوے دوست   مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں   ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اُسکو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اُسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے؛ اور اُسکے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اُس سے بڑھکر نظر آتا ہے تو اُسکا تعاقب کرتا ہے؛ وعلیٰ ہذا۔ اور وجہ اِس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن   ہمکو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب   تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

دو نو جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا   یہاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراخ حوصلگی اور اُسکے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے؛ یعنی میں جو دو نو جہان لیکر خاموش ہو رہا اِسکا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اُن پر قانع ہو گیا؛ بلکہ مجھکو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُنکے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف وہ ظریف جسکی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھکر کہا تھا کہ آپکی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیے! اُسنے یہ سُن کر مجھے بزم سے اُٹھوا دیا! یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُسکو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلےٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اُسکی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے، اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے، کہ اِس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا!!

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت یوسف پر

کتا وہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں
جسکے بازو پہ تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

دمگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دلکے پار
جو مری کرتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اُٹھتیں، بلکہ پلکوں کیطرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

دھاں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اِس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اُسکو ہر شخص ضروری جانتا ہے؛ کیونکہ سب سے حیراں ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ اُنکی گالیوں کا کیا جواب دونگا جبکہ دعائیں سب نبٹ چکیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مِٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے۔ جن کا ترک کرنا اور مِٹانا موحد کا اصل مذہب ہے؛ اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مِٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بنجاتی ہیں۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونو پر محمول ہو سکتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو ۔۔ کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے، بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چاردیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر، ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا، لیکن جس قدر اُسکا دائرۂ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اُسپر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے۔ جسپر حسد و رشک کیا جائے۔ بلکہ اُنکی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے، اور اس لئے انصاف اور فیاضی اُسکے دل میں پیدا ہوتی ہے، اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ "چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو" جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں ۔۔ بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ صواب سے ۔۔ ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلمِ سرنوشت کو

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں ۔۔ ایرا ہی دیکے ہمنے بچایا ہے کشت کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ۔۔ کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا ۔۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ۔ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اِس شعر میں ازراہ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جسکے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ ۔ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کے کی گئی ہے ؛ یعنی یہ مقامات جو اِس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے ۔ اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضاے بلاغت ہے۔

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست ۔ لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اِس شعر کو حقیقت و مجاز دونو پر محمول کر سکتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اُس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جسکے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ! ہم دل میں نہیں ہیں۔ پر یہ بتلاؤ ۔ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اِس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو ۔ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ۔ تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں ۔ خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہم دیا سے گریاں بھی زحمت اٹھانے کی ۔ فلک کا دیکھنا تقریب تیرے [illegible]

یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اُسکے دیکھتے ہی تو یاد آ جاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا ﴿۱۵۷﴾ ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اُس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اُڑ سکے اور کاغذ پر اُسکا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جسپر سے حرف غلط خود بخود اُڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تونے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خط کا کاغذ غلط بردار ہے۔ کہ جو بات سچے دل سے اُسپر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مِٹ جاتی ہے۔

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذرخواہ ﴿۱۵۸﴾ جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق۔ عذرخواہ معافی چاہنے والا، یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعوی ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعوے متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ اُن کی بدمستی وغفلت کا عذرخواہ وہی ہے جسکے پرتو وجود سے تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے ﴿۱۵۹﴾ کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ﴿۱۶۰﴾ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ﴿۱۶۱﴾ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ... بے نیازی تری عادت ہی سہی

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب ... ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے

"گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت ... می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت"

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے ... بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ... دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے ... گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گذرتا ہے؛ اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے؛ پھر اسکے کیا معنی؟ کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور۔ "گر حیا بھی اُسکو آتی ہے" یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے۔ اور "شرما جاے ہے" یعنی غیرت یا اُسکے ساتھ تکرار کرنے سے۔

ہوکے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا ... رنگ کھلتا جاے ہے جتنا کہ اڑتا جاے ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ ... ذکر میرا مجھسے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک میں ملجائیگی ... یہ جو اک لذت ہماری سعی بیحاصل میں ہے

فرداودی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا ... تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق

ـیر نہیں رہی، اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونو مبدل بزمانہ
ـال ہو جائینگے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ قیامت گذر جانے کے دو معنی ہیں، زمانہ
ـنی کا زمانہ گذرنا، اور خود قیامت کا آجانا۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعد قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ـیا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے، اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں
ـسے ناواقف ہے، اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

[illegible] رات کی پی ہوئی خراب جو مرنے سے پہلے پی تھی بعض اندھ شوخی کے [illegible]
[illegible] کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں، تاکہ نکیرین انکی
بوکی [illegible] ہت سے بغیر سوال جواب کئے چلے جائیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ۔۔۔ ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے ۔۔۔ جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۔۔۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی ۔۔۔ سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر ۔۔۔ تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر ۔۔۔ کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

حسنِ مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے ۔۔۔ اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعوی متضمنِ دلیل ہے معشوق کو مہِ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اسکو ماہِ کامل
پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ۔۔۔ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اسمیں سوا ملتا ہے ۔۔۔ وہ گدا جسکو نہو خوئے [illegible] ال اچھا ہے

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

[illegible] ہے کے قریب قریب سعدی رح کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں [illegible] با تو گویم

...ہم کہ از دل بر رود چون تو بیائی" دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف کا رنج و حزن
...نہیں کرسکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری
...دیکھکر سمجھ جائے کہ اسکا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے
...وق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں
...ل باقی نہیں رہتا با اینہمہ سعدی کے شعر کو بہرحال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہئے کیونکہ
...ل المتقدم

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض ۔ اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

...شوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال
...ا بتایا ہے تو اسکے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان
...ہیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا ۔ ۱۹۶ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھیریں ہدفِ ناوک بیداد کہ ہم ۔ ۱۹۷ آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ۔ ۱۹۸ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۔ ۱۹۹ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز ۔ ۲۰۰ سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۔ ۲۰۱ دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو ہیں عاشق تمہارے نام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے باد پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب شاہِ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی کہتا ہے کہ میری قدر اُس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا اور ہر شخص آتے جاتے اُسپر پاؤں رکھکر گذرے یعنی ہوں تو گراں قدر مگر اُس پتھر کی طرح بے قدر ہوں پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے۔

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا ٭ کھل گئی ہیچمدانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اِک بوند لہو کی

لفظ تو نہ وجود دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا اس لئے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھا ہے کہ اسی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے — یہاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی۔

بےحوصلگی یعنی کم ظرفی یہاں سے مراد دنیا معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو یہاں کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

چاک مت کر جیب بے ایام گل — کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے۔

گل کے کھلنے کو چاک گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے کہتا ہے کہ ہر ایک کام غیر کی ہدایت سے کرنا چاہیئے، پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر اسمیں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے - نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد زاہد جو شہد کے پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ہائے وہاں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا — لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

شوخی

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے — عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے — جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اسکی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی نہیں کر سکتا۔

عاشقانہ

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

اسمیں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قوے جن سے عشق کے ترک کرنے یا اسکے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے پس اب عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اسپر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

تصوف

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے — نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا۔ بے شرم و بیباک ہونا۔ پاک۔ آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفاے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھُل کھیلے اِس مطلب کو اِن لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے،، بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اُسکو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے

رباعی

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ — دورِ تو و نزدیک ترا حال تباہ
کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد — اں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اُسکے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اُسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اُسنے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہمکو فنا کر دیا۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھسے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت

نہیں ہوسکتی بلکہ اُسکے لئے وہاں زخم پیدا کرنا چاہئے یعنی جب تک دل تیغِ عشق سے مجروح نہو یہ نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

سر پر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گذر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کیجاتی۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک دو گر غلط چلے کوئی — ڈھانک لو گر خطا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا اُسکے پورے ہونیکے لئے جلدی کرنا چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی ہیں" مقدر ماننے چاہئیں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا — اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

تیغ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی — سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متہم بوجود ہے اور فی الواقع اُسکی کچھ ہستی نہیں ہے اُسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہوجائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنا فی الشمس ہوجاویں، کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونو پہلو رکھتا ہے، مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اُس زمانے میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ اُسکے لئے منت مانتے ہیں، مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا

ادھر آمین تسکر کرا دیں گا کہ ثواب جو انہیں بخشش ہوا ہے مجھ پر موصول ہو گئی جس دن آپ کو میں نذر کردوں گا

ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ اُدھر سفرِ حج کا وہ اشتیاق اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بیقدری۔

رندانہ

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے　　یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

قناعت

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھکو　　ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ سا
مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہیچ نہ سمجھے اُسپر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

قناعت

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں　　گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُسکا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔
خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

عاشقانہ

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

شوخی کوشش

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر　　کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اِس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہوسکتی۔

شوخی

گدا سمجھکے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے　　اُٹھا اور اُٹھکے قدم مینے پاسباں کیلئے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز
رکھتے تھے وہ بھی اِس شعر کے اندازِ بیان پر پروانہ تھے۔ ہمنے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ
کیا ہے یہاں اُسکی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر
بیان کیا ہے اُسمیں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاسبان نے قاتل کے ساتھ

کیا دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونو باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اسکے سوا روزمرّہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اُس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا اُن مدحیہ اشعار میں سے صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے	بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لئے
زمانہ عہد میں ہے اُسکے محوِ آرائش	بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

قطعات

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گذرانا تھا کہ اُنکی تنخواہ جو ششماہی گذرنے پر اکھٹی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ	اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا† ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھکو نہیں — ذوقِ آرایشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال — کچھ بنایا نہیں ہے ابکی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

† بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے نذر کرتے تھے اور خلعت پاتے تھے ۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھکو دیکھو کہ ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میری ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہو مجھکو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری* سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ ۲

گو ایک پادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

* شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے چونکہ یہ قطعہ مرزا نے اپنے خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جسمیں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے ۱۲

کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام ‫ ‫ ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ داب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اس لئے مرزا نے اسکو اس پیرائے میں بیان کیا ہے۔

قطعہ ۳

نہ پوچھ اسکی حقیقت۔ حضورِ والا نے ‫ ‫ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں۔ نکلتے نہ خلد سے باہر ‫ ‫ جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لیے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے اسکے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گذرانتے تھے یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے۔

لطیفہ

جس وقت چوبدار بادشاہی یہ اولوش لیکر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالب علم۔ جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا۔ موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُسنے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا" ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اسنے ایک دفعہ جناب آلہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھپر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں، اور مجھسے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھپر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھکو کھا جائیں"

قطعہ ۴

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو　　اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھولکے کھانے کو کچھ نہو　　روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا جسکو سنکر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

سہل تھا مسہل و لے یہ سخت مشکل آ پڑی　　مجھپہ کیا گذریگی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد　　تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جنمیں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔

قطعہ ۶

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے　　جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے　　کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے[^]

رباعیات

رباعی ۱

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

[^] شریکِ غالب اس کو کہتے ہیں جسکا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریکِ غالب کے صلہ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے۔

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۔۔۔ گویم مشکل وگرنگویم مشکل

اِس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ اگر اُنکی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اِس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھیرتا ہوں پس ہر طرح مشکل ہے

شکریہ

رباعی ۲

بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جم جاہ نے دال ۔۔۔ ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ۔۔۔ ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی یہ رباعی اُسکے شکریہ میں لکھی گئی ہے

مبارک سالگرہ

رباعی ۳

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے ۔۔۔ تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ۔۔۔ ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

شوخی

رباعی ۴

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے ۔۔۔ کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

کہتے ہیں کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ!!! ۔۔۔ وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اِس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ

اور لیت ولعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت ولعل کرنے کو کہتے ہیں چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کام روائی خلق میں جیسی لیت ولعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گذر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

رباعی ۵

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں　　آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن　　خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اُسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رباعی ۶

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں　　عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا　　کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے ظلم سے ہاتھ اُٹھانا اُس سے دست بردار ہونا اور اسکو ترک کرنا باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

رباعی ۷

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے　　بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار　　فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے، اُسکے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بھونری شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔

نثر اردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے، ہاں سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے، اور مہر نیم روز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُسوقت بضرورت اُنکو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُنکی ہمت مہر نیم روز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُسوقت اُنکو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی۔ اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں۔ شاق معلوم ہوتی ہوگی اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں"

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُنکی

ردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے، اور اُنکے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی تر کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے؛ مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود انے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جنیں کھلونا ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے داد سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں؟ تاریخ نمرتبہ (یعنی مہر نیمروز) کے پانسات جزو جو آپکے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے، انصاف سے کہئے کہ یہ نثر کیسی اور ہے؟ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق ہو"

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہئے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض اوقات تحریروں میں دیکھا گیا کہ اُردوے معلیٰ اور بوستان خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے؛ لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدردان بہ نسبت ناقدردانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں؛ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں؛ اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں؛ لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامہ غالب۔ اسکے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصّے کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اِن میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُنکے خطوط ہیں جنیں سے زیادہ تر اُردوے معلیٰ میں اور اُس سے کم عود ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں۔ اور بہت سے خطوط اِن دونو کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔ جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ مگر بتقریب بعض احباب کا ارادہ اُنکے چھپوانے کا ہے۔

۱۴ مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُنکے بعد کسی سے اُسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور اور بہت سی باتیں جنکو مترسلیں نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں، اُسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُنکو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔ مینے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اُسنے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگی؟ اُسنے کہا آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے" اس مطلب کو اُنھوں نے اسطرح ادا کیا ہے "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائینگی؟ آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے۔"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے؛ اُسمیں لکھنا ہے کہ میر نصیر صاحب آئے اور اُنسے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُسکو اسطرح شروع کرتے ہیں "اے میر نصیر صاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں؛ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میر نصیر صاحب اُسکے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا؛ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپکے

فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہونگے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو تبلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے
ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔
اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟
سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں
تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں آج پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں؛ میری روانگی کے تین دن بعد
آپ خط شوق سے لکھئے گا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو؛ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟
میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ"
اسکے بعد میر مہدی سے مخاطب ہوکر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

۴ بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اسکو غائب فرض کر لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو لوگ
مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اُسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے
ہیں "میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے
کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے
یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی؛ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا
مگر میں نے اسکو بحل کیا؛ اللہ برکت دے" ×

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں؛ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے
محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی ان کھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اُسکے
دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے —

ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر اُن کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے؛ میری نسبت نہیں لکھا؛ اُسی قدر اُنکو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں از راہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

۴ مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں اُنمیں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُنکے ناموں کی کوئی علامت لکھدی جاتی ہے؛ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے؛ اور نہ اُنکے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ اور جواب کیا؟ شاید قصے یا نوول میں یہ بات نہ چل سکے؛ مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اُنکی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ چیز جسنے اُن کے مکاتبات کو نوول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے؛ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے؛ مگر اُنکی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں؛ اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اُسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، پولیٹکل

سوشل، اور بعض مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں؛ بایوگرفی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں؛ باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اسکو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو، پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے؛ اسمیں اُن کی لڑکی کو۔ جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہوگئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تمکو کیونکر دیکھیں گے؛ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں" یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جو اب رئیس لوہارو ہیں۔ انکے بچپن کے زمانے میں انکے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں "اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب۔ اپنے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی پتلی۔ چشمِ جہاں بیں تمھارا باپ مرزا علاؤ الدین احمد خاں بہادر۔ اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں؛ میں تو صرف تمھارا دل دادہ ہوں۔"

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے انھوں نے اسکا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اسکے جواب میں انکو اس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہمکو پسند نہیں؛ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو؛ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہوگے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"

شوخی

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے؛ اُس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں؛ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں؛ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے؛ اور روزہ بہلانا اور بات ہے"

جس زمانے میں برہانِ قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلف برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُنکی اور اُنکے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں "اِن فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا۔ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں؛ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔

لطیفہ

ایک گائے* کا بچہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا؛ بنی اسرائیل اُسکو خدا سمجھے"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاؤ الدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں "اُستاد میر جان کو اس راہ سے کہ میر تقی کی بھتیجی اُنکی چچی تھیں اور یہ مجھسے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں۔ بندگی۔ اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں۔ درود۔ اور موافق مضمون اس مصرع کے "سوے اللہ واللہ ما فی الوجود" سجود"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں "دیوانخانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا؛ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے؛ ابر دو گھنٹے

* یہ اشارہ صاحب برہان قاطع کی طرف ہے۔

ہے تو محبت چار گھنٹے برتی ہے،،

نواب علاؤالدین خاں اور انکے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاؤالدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں ،، سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزولِ اجلال کیا۔ پہر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے ۔۔۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی؟ جتنا تم اسکو چاہتے ہو۔ ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر انکو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے،، ×

ایک دفعہ کثرتِ اخراجات سے تنگ آکر بعض ضروری خرچ بند کر دئے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے نواب علاؤالدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اسکا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو الخ" اسکا جواب اس طرح لکھتے ہیں "بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی؛ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھکر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل میاں کے سر، بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے؛ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے، مول میں قسط اسکو دینی پڑے؛ اُنکم ٹکس جدا، چوکیدارہ جدا، سود جدا، مول جدا،

بی بی جدا، بچّے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ[۱۶۲] ؛ تنگ آگیا، گزارا مشکل ہوگیا؛ روزمرہ کا
کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش صبح کی
تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف ۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا،
روزمرہ کا خرچ چلا ۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے
پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے ۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا
کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا ۔ قرض مقسط ادا ہوگیا ۔ متفرق رہا؛ خیر رہو ۔ صبح کی
تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی ۔ گوشت پورا آنے لگا ۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی
اُنکو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ''

اے بےخبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما '' دیکھا ہمکو یوں پلاتے ہیں ۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھاکر
مولوی مشہور ہونا اور مسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے؛ اور عرفا کے
کلام سے حقیقت حقّہ وحدتِ وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے ۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک
جانتے ہیں ۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں ۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلوں
کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں ۔ دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے ۔ میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں
زبان سے لا الٰہ الّا اللہ کہتا ہوں؛ اور دل میں لا موجود الّا اللہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں
انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے ۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم
ہوئی ۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں ۔ مقطع نبوّت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ
ہے اور امام من اللہ علی علیہ السّلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السّلام ''بر''

زیستم ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور
اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن
ہونگا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کردونگا؛ تاکہ مشرکینِ نبوتِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اُسمیں جلیں۔۔۔
سنو! مولوی صاحب تمنے کئی فاقوں میں۔ ایک شعر حافظ کا حفظ کیا "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو" الخ
اور پھر پڑھتے ہو اُسکے سامنے کہ اُسکی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دوچند سہ چند ہے؛ مجموعۂ نثر جداگانہ؛
اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اسکے مخالف ہیں"

ایک خط میں تعلقاتِ خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں "سنو! عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح
اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم اِن دونو عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر
آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار" ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح
میں سزا پاتے ہیں؛ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ
میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات
میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے
پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا؛ اور مجھے اُس زنداں میں ڈالدیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت
ٹھیرایا۔ برسوں کے بعد میں جیلخانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے
کلکتے سے پکڑ لائے؛ اور پھر اُسی محبس میں بٹھادیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے† دو ہتکڑیاں اور

† بیڑی سے مراد اہلیہ اور دو ہتکڑیوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں جنکو مرزا نے اُنکے والد زین العابدین خاں کی
وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا۔

بڑھادیں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت
یکقلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونو ہتکڑیوں کے بھاگا،
میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگونگا
بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اِس
ماہِ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد
نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔ فرخ آں روز کہ ازخانۂ زنداں بروم * سوی شہرِ خود ازیں وادی ویراں بروم
ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو اُنکی محبوبہ چناجان کی تعزیت میں لکھا ہے اسمیں لکھتے ہیں "آپ کا
غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپکا معاملہ
بیان کیا یعنی اُسکی اطاعت اور تمھاری اُس سے محبت سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب شعرا میں
فردوسی اور فقرا میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر
کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؒ سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ
مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلی اُسکے سامنے مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اُس سے
بڑھکر ہوئے کہ لیلی اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں
جسپر مرتے ہیں اُسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک ++++ کو میں نے بھی مار رکھا ہے
خدا اُن دونو کو بخشے اور ہم تم دونو کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس
بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن کبھی
کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُسکا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی

صبر کرو اور ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔ سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی + عشق محمد بس ست و آل محمد +
اللہ بس ماسوائے ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چُنّیا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ مرزا صاحب!
ہمکو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدای شباب
میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی۔ کہ ہمکو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو،
کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔
کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا
شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چُنّیا جان نہ سہی مُنّا جان سہی۔
میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی،
اقامت جاودانی ہے، اور اُسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور
کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہئے ہئے وہ حور اجیرن ہو جائیگی، طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی۔ وہی زمردیں کاخ اور
وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بددور، وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زن نو کن اے دوست ہر نو بہار کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اُسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں + حلیۂ مبارک
نظر افروز ہوا +++ تمھارا حلیہ دیکھکر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا کسواسطے کہ میرا قد بھی
درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کسواسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا
رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر

سانپ سیاہ پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری؛ بقول شیخ علی حزیں

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں — شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

"جب ڈاڑھی موچھ میں بال سفید آگئے؛ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے؛ اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے؛ ناچار مسّی بھی چھوڑدی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام؛ مُلّا حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جُلاہہ، کنجڑا، مُنہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جنمیں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا؛ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی۔ کہ میں نے بچپن سے آج تک اُسکو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھکو بیٹا سمجھتی تھی۔ مرگئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے؛ تین پھپھیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ، اور ایک دادی، اور ایک دادا؛ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اُسکے مرنے سے مینے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مرگئے"

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں "آج تم دو نو بھائی اس خاندان میں

+ یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جبتک مجھے موقع ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی منڈاتا رہا؛ اسلئے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں ۱۲

شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو، مَیں لم یلد ولم یولد ہوں۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں "یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کر لیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد انکے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ مَیں اُن سے پُوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے عزت؟ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دونگا"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اُسکی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں "صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش انکا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدت

پھر دوسرا جنم ہمکو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے؛ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اسکا جواب مجھکو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اسکا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ؛ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔

ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں "کل تمہارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے؛ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جسمیں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جسمیں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھسے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جسمیں میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں؛ ایک کیپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں ۔۔۔

امرای اہل سلام میں اموات گنو تو حسن علیخاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپیہ روز کا پنشن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار بنکر نامرادانہ مرگیا۔ میر ناصرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا؛ انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جسکا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اسکے پاس ایک پیسا نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے

بلکہ یہی دو دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاءالدولہ کی پانسو روپیہ کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی ؛ تباہ و خراب لاہور گیا ؛ وہاں پڑا ہوا ہے ؛ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلبھ گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اسکو بھی سچ جانو،،

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا ہے جس سے اُنکے خیالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً

ایک خط میں لکھتے ہیں ،،ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی رکاب میں پانو ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر ؛ اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں ،،تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی ؛ باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی

وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھکر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے! اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گذر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونو عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونو اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے اُنکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہمکو تمکو ہوگا''

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات باردہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی تحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم ما لا یلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اسکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو رقعات میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاصکر

ان خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی یا ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں

یوسف مرزا کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر: یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھسے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا: نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ،،

اُنھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "اے میری جان! اے میری آنکھو!

"ز ہجرانِ طفلے کہ در خاک رفت　　چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لیکر آیا تھا۔ یہاں رہکر کیا کرتا؟ ہرگز غم نکرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو خدا تمکو جیتا رکھے؛ اولاد بہت۔ نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملۂ واقعات کربلا کے ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

مرزانے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفےٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اُردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً سجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنّع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اسمیں معذور سمجھنا چاہئے، جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارِدہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اسکو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اسکا کہیں نام و نشان نہ تھا باایں ہمہ انہیں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے منشی ہیرلال صاحب کی کتاب سراج المعرفۃ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوّف کے اعلےٰ خیالات ظاہر کئے ہیں اُسکے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوّف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اُسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفۃ۔ جسپر مرزانے یہ دیباچہ لکھا ہے۔ اُسمیں منشی ہیرلال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و اذکار۔ جو آنحضرتؐ کے زمانے سے اُسوقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کئے تھے۔ مرزانے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفتِ الٰہی میں کیا دخل ہے، اور کیونکر انکے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے، دیباچۂ مذکور کا اوّل و آخر کا حصّہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزانے مذکورۂ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ وہ حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامہ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جسکے

عنوان پر لکھا ہے "لا موثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے "لا موجود الا اللہ" اور اس
خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی
حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں: آثاری، افعالی، صفاتی،
ذاتی۔ انبیائے سابقین صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلان مراتب سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم
...ات اعتباری اٹھا دیں؛ اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں؛
...امت محمدی کا سینہ ہے؛ اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ نہ ہے
... وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل
مقصود ہے انکی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی
قدمگاہ پر آئیں گے یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے
شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے مژدہ
روح افزائے "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ"

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوئی توحید میں وہ لذت ہے
کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے۔ ایک جہت خالق کہ جس سے
اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ ست دلجوے خلق — یکے سوی خالق یکے سوی خلق
بدان وجہ از حق بود مستفیض — بدین وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" معنی اسکے صاف اور از روے انصاف یہ ہیں

کہ ولایت نبی کی وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوّت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے ۔ نہ یہ کہ ولایت عام
افضل ہے نبوت خاص سے ۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اسی طرح ولی
مستنیر ہے انوار نبوت سے ۔ مستنیر کی تفضیل مُنیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور
عقلا کے نزدیک مقبول نہیں ۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھا نبوّت کے ساتھ منقطع ہوگئی مگر وہ
فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے
چراغ جلتا چلا جاتا ہے ۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہیگا ۔ اور اب اسی کا نام
ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت ہے ۔ ولایت و ہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو ازروئے
کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مشہود عیونِ اعیان اُمت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے ۔ مگر وہ بات اب
کہاں کہ ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہنے اور عقل بغیر معرفت سے منور ہو جاوے ۔ اور وہ ضامن نرسبت بردوش
کہاں کہ قائل لا الٰہ الا اللہ کو اگرچہ اسکے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہ توحید پر قائم کردے ، یعنی
رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم ۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے
اور راحت بعد جراحت سچ بھی تو ہے ، آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلانِ بدیہیات کے جواز پر
اسکو کیونکر تسلی ہو ، یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں نیست و نابود
محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے ۔

اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیچ — در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش سے دانی — ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے ۔ کہ وہ اطبار روحانی ہیں ۔ دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب

لا، وہم کے مشاہدۂ وحدتِ ذات سے محروم رہے جاتے ہیں؛ ہر چند اُنکو سمجھائیں گے،
بر نہ آئینگے۔ ناچار اشغال واذکار وضع کئے تا قوت متخیلہ اسمیں اُلجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی
ں ہو جاوے۔ وحدت وجود اِس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہوا ور ہم اُسکو بجبر یا بہ تکلف ثابت
ہتے ہوں۔ دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست ✤
مورتگری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہ وہم شغل و ذکر
ف مشغول ہو گیا بے شبہہ اپنے کام سے یعنی صورتگری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔
ی اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے اِس شاغل کے
ں کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جان کر کودا؛ ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا!
م دونو کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں؛ مگر ہاں
ں، اور مخفی ہیں، اور کہیں کہیں ہیں اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالتِ بیخودی کے واسطے
، اشغال واذکار ہیں؛ بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں،،

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ اُسکو اس زمانے میں کما حقہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ جبکہ اُس زمانے میں جب بہت سے سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدردانی کی شکایت کرتے تھے؛ تو اب کیا امید ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو اُنکی قدر جیسی چاہئے جانیں۔ جسے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ اُنکے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونے کے پبلک کے سامنے پیش کردیں؛ اور چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہوگئی ہے اسلئے جہاں جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی سمجھدار آدمی اُسکا کسی قدر اندازہ کرسکیں؛ لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جسکے نقاد اور جوہری ملک میں کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ اُسکی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھدینا کافی معلوم ہوتا ہے۔

بیا ور ید گر ایں جا بود زباں دانے غریب شہر سخن ہاے گفتنی دارد

البتہ ایک مختصر امر مرزا کے متعلق بیان کردینا ضرور ہے جو اُنکا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہئے۔

اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق و ماہر و مسلم الثبوت اُستاد کو ہونی چاہئے،

لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت
دیکھی گئی ہے - اسی طرح مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنے نہ تھے. تصوف، حبِ اہلِ بیت، فخر، شوخی و
ظرافت و رندی و بیباکی، بیان رنج و مصیبت و شکایت و زارنالی، اظہار محبت و ہمدردی،
حسنِ طلب؛ یہ چند میدان ایسے تھے جنکا بیان مرزا کے تمام اصنافِ سخن میں اکثر نہایت
لطیف و ملیح و مرقّص واقع ہوا ہے. بیشک یہ بات اُنکے عشقیہ مضامین اور اخلاق و موعظت کے
بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی؛ کیونکہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملاتِ عاشق و معشوق
کا بیان - جیسا کہ ظاہر ہے - محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے -
جسکو مرزا نے جابجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے - ابا کرتا ہے. برخلاف اسکے مرزا اصناف
کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الاماشاءاللہ) اسی لیے
اُنکے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان
اور غزل کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی. اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لئے
موثر اور دلاویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہو دلوں
میں گھر نہیں کرسکتا. مگر اس سے مرزا کی اُستادی میں کچھ فرق نہیں آتا جب سعدی کی رزم کی نسبت
کہا جاتا تھا "کہ ایں شیوہ ختم ست بر دیگراں" اور اُسکا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا - اور
باینہمہ سعدی کی اُستادی کو سب نے تسلیم کیا - تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے
سے مرزا کی اُستادی میں کیونکر فرق آسکتا ہے. یہ میزان جو ہمنے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے
اُسکو انکے کلیاتِ نظم و نثر میں جانچنا چاہیے؛ نہ انتخابی اشعار میں جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پردازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اُسمیں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا جسکا زمانے میں کوئی قدردان نہ تھا۔ اُنکے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے۔ جو فارسی زبان اور خاصکر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین و امرا و رؤسا تھے۔ جنکو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔ وہ شخص۔ جسکا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جسکی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابو الفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں۔ اُسکو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا؛ اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔ گورنمنٹ کے ارکان و اعیان کی مدح کے صلہ میں مرزا کو اُس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور اُنکے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے بلا شبہہ ملک میں بیشمار تھے؛ مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور اُنکی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔ پس جبکہ ممدوحوں کی قدردانی کا وہ حال ہو؛ اور مادحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ؛ تو پھر وہ کیا چیز تھی جسکو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے؛ بلکہ اُس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں۔ جو خواہی نخواہی اُسکو ترقی کرنے پر

مجبور کرتی ہیں ؛ اوّلاً سبقِ استعداد اور فطری قابلیت جسکا اقتضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدردان یا مخاطب صحیح نہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کئے بغیر نہیں رہتی ۔ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں اُسکو مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گزیر نہیں اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے بغیر اسکے کہ ملک میں کوئی اُسکی قدر کرے یا اُسکے کمال کی داد دے اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ دوسرے اُس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اُس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اِس بات کا یقین ہے کہ سوسایٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقۃ سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں ۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبیعی اختتام کے قریب پہنچ چکی تھی ؛ مگر حسنِ اتفاق سے اِس اخیر دَور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دار الخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے ۔ اِن چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی ، مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں متخلص بہ آزردہ ، مولوی عبد اللہ خاں علوی ، مولوی امام بخش صہبائی ، حکیم مومن خاں مومن ، نواب مصطفےٰ خاں حسرتی ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ ، سید غلام علیخاں وحشت وغیرہم ہیں ۔ درحقیقت اِن لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا اُنکی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں ، ابو الفتح ، فیضی ، اور ابو الفضل کا اُنکے زمانے میں ہونا ۔

اگرچہ اِن بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہرا مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے

لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لئے جس طرح قدردانوں کی تحسین و آفرین سے
مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے انکو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا؛
اور انکے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لئے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی؛ اور اسطرح
قدردان اور نکتہ چیں دونو انکی ترقی کے باعث تھے.

مولانا فضل حق باایں‌ہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے اُسکا اندازہ حکایتِ ذیل
لطیفہ
سے ہو سکتا ہے. مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے
معنی مرزا صاحب سے جاکر پوچھے. اُنھوں نے کچھ معنی بیان کئے. اُسنے وہاں سے آکر مولانا سے
کہا "آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں؛ آج اُنھوں نے
ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کئے"؛ اور پھر وہ شعر پڑھا؛ اور جو کچھ مرزا نے اُسکے معنی کہے تھے بیان
کئے. مولانا نے فرمایا پھر اِن معنوں میں کیا برائی ہے؟ اُسنے کہا برائی تو کچھ ہو یا نہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود
نہیں ہے. مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لئے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اُسنے سخت غلطی کی.

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ
مقطع یہ ہے.

توہم میں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نکنم شیخ علی رامانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سُنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اسمیں بالکل مبالغہ نہیں
ہے. مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے.

لطیفہ
ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سُنکر کہا کہ مومن خاں نے

یہ اِسلئے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے،،

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہمپایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے اُن کو بمراتب برتر اور بالاتر سمجھتے تھے۔ نواب ضیاءالدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسروؒ) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اُسکا خاتمہ ہوگیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہوجاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا؛ اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ بیشک مرزا کی طرز خاص کو جو اُنھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے؛ اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہوگیا تھا وہ اخیر تک اُنکے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اُسمیں اِس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا اُنکی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدہ کی تمہید میں اپنے مصائبِ ایام و شکایتِ روزگار وغیرہ کا بیان ہے؛ اُسکے بعد مدح کی طرف اِس طرح گریز کرتے ہیں۔

باچنیں اندہ کہ پُر گفتیم و دل خالی نشد — خواجہ گر اندہ گسارِ من نبودے۔ وائے من

آنکہ در یکتائی بودے در فنِ فرزانگی — متفق گردیدہ راے بو علی با راے من

آنکہ چوں خواہد بنامش نامہ نامی ساختن — بنگارد عقلِ فعالش ہو کرم فرماے من

دل بریں وصف نیاسایہ سخن کوتہ کنید　　　آنکہ ننگ اوست بودن سخن ہمتاے من

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقل فعّال کا اُسکو "از شعرائے من" لکھنا یہ سب باتیں اسکی مدح کے لئے کافی نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اُسکے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اسمیں قطع نظر اسکے کہ ممدوح کی اور اُس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جبکہ راقم بھی وہاں موجود تھا۔ آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے، کھانے میں دیر تھی۔ فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ اُن میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جسکا مطلع یہ ہے۔

نشاط معنویاں از شرابخانۂ تست　　　فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھالئے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا "دیکھئے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے"۔ یہ کہکر غزل پڑھنی شروع کی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ اُنکی عادت تھی کہنے لگے "کلام مربوط ہے مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے"۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی۔ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کرکے ، رمز کی ادا سے یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی　　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اُسوقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرماکر خاموش ہو رہے۔

صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اُس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا اس سے وہ مرزا کو اور مرزا اُنکو کم مانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے ٹمٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی اُن کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی، چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں اُنکے دیوان میں ابتک موجود ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری، اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں جسکا ترجمہ یہ ہے "اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے۔ دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُنکے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، اُنکو میرے حال پر رحم آیا اور اُنھوں نے مجھپر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھکو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اُسکو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھکو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار۔

جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر انکی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنکی غزل میں نہ صرف نظیری۔ بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی جلال اسیر اور انکے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے۔ کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ انکی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں۔ جن میں عنصری سے لیکر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سرآوردہ ہوا ہے اُسکا نام لیا ہے۔ اُنکے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اُسپر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم اُسکو یہاں نقل کرتے ہیں ناظم کہتا ہے۔

"شنیدم کہ در دور گاہ کہن | شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی | بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن | بہ خاقانی آمد بساط سخن
چو خاقانی از دار فانی گذشت | نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل درکشید | سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد زکار | سخن گشت بر فرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید | ز جامی سخن را تمامی رسید"

اسکے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

"زجامی بہ عرفی و طالب رسید | زعرفی و طالب بہ غالب رسید"

اگرچہ مرزا نے بیدل اور اُنکے متبعین کی زبان اور اُنکے انداز بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اِس خصوص میں وہ اہلِ زبان کے طریقے سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اِس مقام پر اُنکی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کرینگے جنکے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور اُنکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخابِ غزلیات فارسی

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری | طرۂ پُرخم صفات موی میاں ما سوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اُسکا طرۂ پُرخم کیا ہوگا؟ صفاتِ الٰہی۔ اور اُسکا موی میاں کیا قرار پائیگا؟ ما سوی اللہ۔ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرّہ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اور چونکہ ماسوے اللہ کو صوفیہ معدومِ محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں۔ اِس لئے شاہدِ حسن حقیقی کی کمر ماسوے کو قرار دیا ہے۔

آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہدر | جاں نہ پذیری بہیچ نقد خضر ناروا

ہدر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیواں کی تلاش میں گیا تھا مگر ناکام رہا۔ کہتا ہے کہ تو زورِ

سے کسی کو پانی نہیں دیتا ۔ پس اگر سکندر آبِ حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہو جائے تو ہو ۔
دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے ۔ یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے
مگر تو اُسکو قبول نہیں کرتا ۔ اور اس لئے اُسکو کسی طرح موت نہیں آتی ۔

بزمِ ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب | سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ نشانۂ حوادث و
مصائب و آلام ہیں ۔

سادہ ز علم و عمل مہر تو ورزیدہ ام | مستیِ ما پایدار بادہ ما ناشتا

ناشتا ناشتا منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا ۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گو میں نے شراب کا ایک قطرہ
نہیں پیا مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں ۔ یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا مگر تیری محبت میں سرشار ہوں ۔

قطعہ

۱ اے خاکِ درت قبلۂ جان و دلِ غالب | کز فیضِ تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را
۲ تا نامِ تو شیرینیِ جان دادہ بگفتن | در خویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آنحضرت کا نام مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیار سے
اُسکو اپنے اندر اُتار لیا ۔

ما ہمائے گرمِ پروازیم فیض از ما مجوے | سایۂ ہمچوں دود بالا مے رود از بالِ ما

یعنی ہماری پرواز میں اس قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اسی طرح ہمارے
پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر اوپر جاتا ہے ۔

حال ما از غیر می پرسی و منت می بریم — آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حال ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے ہم اسی بات کے شکرگذار ہیں، غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھکو ہمارے حال کی خبر نہیں۔

دل مایوس تسکین م دن میتوان دادن — چہ امیدست آخر خضر و ادریس مسیحا را

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن — ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

وقت تاراج غم تست چہ پیدا چہ نہاں — ہمچو رنگ از رخ ما رفت دل از سینہ ما

جوے از بادہ و جوئے ز عسل دار خلد — لب لعل تو ہم این است نہ ہم آنست مرا

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت — منتے بر قدم راہ رواں ست مرا

یعنی راہ کے تمام خاروخس میری گرمی رفتار سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ انکے لیئے میں نے رستہ بالکل صاف کردیا ہے۔ یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے وہ سب میں نے اس طریقے پر چلکر دور کر دیئے ہیں اور آیندہ آنے والوں کے لیئے راہ صاف کر دی ہے۔

رہرو تفتہ، ور رفتہ بہ آبم غالب — توشہ بر لب جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لو سے جلا بھنا۔ پانی کو دیکھکر بے اختیار اسمیں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے پر اسکا زاد راہ پڑا رہجائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھکو محض انکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

دنیا

سایہ و چشمہ بصحرا دمِ عیشے دارد — اگر اندیشہ منزل نبود رہزنِ ما

یہ دنیا کی مثال ہے: یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے۔ مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اس لئے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

مے پرد مور مگر جاں بسلامت ببرد — تا چہ برق ست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہماری خرمن پر کون سی بجلی گرنیوالی ہے کہ چیونٹے جان بچانیکے لئے پہلے ہی سے اڑے جاتے ہیں۔ تمثیل کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

فخریہ

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر — نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے، گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اٹھتا۔

فخریہ

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے یعنی ہمنے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہمکو مجبور کیا کہ ہم اسکو اپنا فن قرار دیں۔

شکایت

با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمی کنند — خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے: یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کیجاتی ہے؟

فخریہ

بر روے حاسداں درِ دوزخ کشودہ رشک — از بہرِ خویش جنتِ در بستہ ایم ما

یعنی ہم اپنا کمال دیکھکر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لئے جنتِ دربستہ ہیں پس چونکہ ہماری

جنت کی کیفیت سے اور جو اسمیں لذت و راحت ہے اُس سے حاسد لوگ بیخبر ہیں۔ اسلئے رشک سے اُنکی یہ حالت ہے کہ گویا اُنپر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

سوزِ ترا رواں ہمہ در خویشتن گرفت | از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے؛ اور ذرہ برابر کسی کیلئے اُسمیں سے حصہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغ دار قرار دیتے ہیں درحقیقت اُسپر تہمت رکھتے ہیں۔

با چو توئے معاملہ بر خویش منت است | از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

روئے سیاہِ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم | شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

کدوئے چوں زمے یابم خیالِ خویشتن بالم | کہ پندارم سر آمد روزگارِ بے نوائیہا

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا مجھکو ملجاتا ہے تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس اب بے سروسامانی کا زمانہ ختم ہوا۔

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقوےٰ مائل ست اما | ز ننگِ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے اسلئے میری کافر کی سی حالت ہے ورنہ تقوےٰ کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔

در شربِ حریفاں صفتِ خود نمائی | بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

حریفاں کا لفظ فارسی میں ایسا ہے جیسا اُردو میں یار لوگوں کا لفظ؛ اور اصلی معنی اسکے ہم پیشہ ہیں۔ جب شرابخوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اُس سے مراد شرابخوار ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم

قدح بخواروں کے مشرب میں خود نمائی منع ہے۔ دیکھو جمشید جو بادہ نوشی میں ضرب المثل ہے اسکے ہاں آئنہ خود نمائی یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا۔ نہ تھا۔

شوخی

بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار چنانکہ — زما گسستی و با دیگراں گرو بستی

یعنی اگر تونے ہمسے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیمان باندھا ہے تو اسکا خیال نکر اور بے تکلف ہمارے پاس چلا آ؛ کیونکہ عہد وفا تو ٹوٹنے ہی کے لئے باندھا جاتا ہے؛ وہ کبھی استوار نہیں ہوتا؛ جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھکر ٹوٹ گیا۔

انداز

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا — وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

یعنی وداع میں اور لطف ہے اور وصل میں اور لذت ہے بس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار کے لفظ نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے کیونکہ شاعر باوجودیکہ لذت میں وداع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا؛ اور جانے کے لئے ہزار بار اور آنے کے لئے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

موقع

متاعِ میکدہ مستی ست ہوشیار بیا — رواجِ صومعہ ہستی ست زینہار مرو

یعنی صومعہ میں ہستی و پندار و غرور کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا؛ اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے وہ مستی ہے؛ یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظرفِ عالی لیکر آنا چاہئے۔ مستی حاصل کرنے کے لئے ہوشیار ہو کر آنا۔ اِسمیں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

رشک
زار نالی

رشک نگذارد کہ گویم نام را — چوں بقاصد بسپرم پیغام را
کو چراغے تا بجویم شام را — گشتہ در تاریکیِ مردم نہاں

یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اُسکی تاریکی دونوں مل گئیں ؛ اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود خوش بود گرد انہ نبود دام را

یہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اُردو میں اس طرح باندھا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

دلستاں در خشم و غالب بوسہ جو شوق نشناسد ہمے ہنگام را

در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را مہتاب کفِ مار سیاہست شبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامانِ عیش و طرب مہیا ہوتا ہے اُس سے میری بیقراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش و طرب کی محرک ہے وہ میری رات کے حق میں مار سیاہ کے پھن کا حکم رکھتی ہے۔

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھکو یہ شبہ بھی گذرے کہ دریا نے مجھے دیکھکر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحلِ دریا پر جان دیدونگا مگر حلق تر نکرونگا۔

بپایانِ محبت یاد می آرم زمانے را کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے ؛ کہ اب انتہائے محبت میں جبکہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم و بیوفائی کی کچھ حد نہیں رہی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے دل اُسکو دیا تھا اُسوقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ دل کا دینا کوئی اختیاری بات

نہیں ہے؛ اگر جس طرح بیع و شرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں اُسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لی جاتی۔

آوازۂ شرع از سرِ منصور بلند ست — از شب روی است شکوہ عسسِ ما

شب روی - چوری کے لئے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دی جائے تو شریعت کی شان و شوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ بس ہم جو مرتکب جرائم ہوتے ہیں گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

وقت است کہ خونِ جگر از دیدہ روشد — چند آنکہ چکد از مژۂ داد رسِ ما

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اِس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خونِ جگر رو دے اسقدر آئے کہ حاکم داد رس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

در دہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود — بر قند - نہ بر شہد نشیند مگسِ ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں مگر اُن میں پھنستے نہیں جیسے وہ مکھی جو قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اُڑ گئی نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر اُبھر نہیں سکتی۔

بادۂ شبگیری ما بید - و کنار کشتِ ما — کوثر و سلسبیل ما - طوبیٰ ما بہشتِ ما

حسرتِ وصل از چہ رو - چون بخیال سرخوشیم — ابر اگر نبارید - بر لبِ جوست کشتِ ما

یعنی جبکہ ہم خیالِ دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔ اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے؛ ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

بردہ صد ابلیس بسر بر سرِ صد ہزار خم — گر بنہی در آفتاب بادہ چکد ز خشتِ ما

بادہ اگر بود حرام - بذلہ خلافِ شرع نیست　　　　دل نہ نہی بہ خوب باطعنہ مزن بہ زشت ما

زہاد کی طرف خطاب ہے جو شرابخواری اور رندانہ بذلہ سنجی دونو کو برا سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلافِ شرع نہیں ہے؛ اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے پسند نہیں کرتا تو بذلہ سنجی جو ہماری ادنی درجے کی چیز ہے اُسپر تو طعن مت کر۔

گفت بحکمِ حسرتی غالبِ خستہ ایں غزل　　　　شاد بہیچ می شود طبعِ وفا سرشتِ ما

یہ غزل غالباً اُس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جبکہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم متخلص بہ حسرتی کے مکان میں مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی، و صہبائی، و آزردہ، اور مومن اور نیر وغیرہم سب اُسمیں شریک ہوتے تھے اس مقطع میں مرزا نے مصرع طرح کو تضمین کیا ہے اب اسکے معنی یہ ہوگئے کہ ہمسے جو اِسطرح پر غزل لکھنے کی فرمائش کی گئی ہماری طبعِ وفا سرشت دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہوجاتی ہے۔

مُردم ز فرطِ ذوق و تسلی نمے شوم　　　　یا رب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزا دیا ہے کہ اُسکی تعریف کرتا کرتا مر گیا؛ اور پھر بھی تسلی نہوئی الٰہی اس لبِ خنجر ستا کو کہاں لیجاؤں کہ جہاں جا کر تسلی ہو۔

شبہم تاریک و منزل دور و نقشِ جادہ ناپیدا　　　　ہلاکم جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہے را

پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شبِ تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں ہلاک یعنی قربان ہوں برق شراب کی چمک پر جو کبھی کبھی چمک جاتی ہے اور اُس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آجاتی ہے مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی مل جاتی ہے صرف اُسکی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔

مے باندازہ حرام آمدہ - ساقی برخیز　　　　شیشہ خود بشکن بر سر پیمانۂ ما

برخلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار اس شعر میں افراط شوق کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گذر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اُسکی خواہش کیجائے جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھکر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں بس گو کہ مضمونِ شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اُسکا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

مو برآید زکفِ دست اگر دہقاں را　　　　نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانۂ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی - کہتا ہے کہ اگر کاشتکار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُسمیں سے ریشہ نکل آئے یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

خرابیم و رضایش در خرابیہای ما باشد　　　　ز چشم بد نگہدار و خدا ما دوستکاماں را

خراب - مست، ویران، اور تباہ، تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جسکی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو یعنی عمدہ حالت ہو - کہتا ہے کہ ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں پس ہم دوست کاموں کو جنکی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالے نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

بسا افتادہ - سرمست و بسا افتادہ در طاعت　　　　تو دانی تا بہ لطف از خاک برداری کداماں را

عالم آئینۂ رازیست چہ پیدا چہ نہاں	تاب اندیشہ نداری بنگاہے دریاب

یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اُسکا ظاہر اور باطن سب مظہر اسرار الٰہی ہے۔

فرصت از کف مدہ وقت غنیمت پندار | نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

گر پس از جور بہ انصاف گراید چہ عجب | از حیا روے بما گر ننماید چہ عجب

کہتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پہلے ظلم یاد کرکے حیا سے ہمکو مُنہ نہ دِکھلائے تو کچھ تعجب نہیں مطلب یہ کہ انصاف بھی کریگا تو اس طرح کریگا کہ ہم اُسکے دیکھنے سے محروم رہیں۔

بود دش از شکوہ خطر ورنہ سری دشتمن | بمزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

باچنیں شرم کہ از ہستی خویشش باشد | غالب از رُخ بہ رہ دوست نسایدچہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ تعجب نہیں۔

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است | آرے کلام حق بزبان محمد است

آئینہ دار پرتو مہرست ماہتاب | شانِ حق آشکار ز شانِ محمد است

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است | اما کشاد آں ز کمانِ محمد است

دانی اگر بمعنی لولاک وا رسی | خود ہر چہ از حق است از آنِ محمد است

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد | سوگندِ کردگار بجانِ محمد است

واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گذار | کاینجا سخن ز سرو رِ روانِ محمد است
بنگر دو نیمہ گشتن ماہِ تمام را | کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمد است
ور خود ز نقشِ مُہرِ نبوت سخن رود | آں نیز نامور ز نشانِ محمد است
غالب ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم | کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

یہ غزل مرزا نے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چونکہ وہ تخمیس اب تک شائع نہیں ہوئی اسلئے مقتضائے مقام یہ ہے کہ اسکو بھی اس غزل کے ساتھ نقل کر دیا جاے۔

اعجاز از خواصِ لسانِ محمد است | عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمد است
گر نور و گر ہُدے کہ از آنِ محمد است | حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمد است

آرے کلامِ حق بزبانِ محمد است

دانی ز پیشِ چشمِ تو بر خیزد از حجاب | کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب
باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب | آئینہ دارِ پرتو مہر ست ماہتاب

شانِ حق آشکار ز شانِ محمد است

لطفِ خداست گر بہ کسی شاد و ست | قہرِ خداست چوں ز کسی بحجۂ ست
داند کسیکہ شد ز رمے ما رمیت مست | تیرِ قضا ہر آئنہ در ترکشِ حق است

اما کشادِ آں ز کمانِ محمد است

گوئی اگر بعالمِ ادراک واری | بینی اگر بہ دیدۂ دراک واری

سنجی اگر بمرتبہ خاک وارسی ‏ — ‏ دانی اگر بمعنی لولاک وارسی
خود ہر چہ از حق است از آنِ محمد است

شاہد بقتلِ عاشق و عاشق بجانِ خویش ‏ — ‏ مجنوں بپاے لیلی و لیلی بفرقِ خود
مومن بہ آلِ احمد و آتش بروحِ جد ‏ — ‏ ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمد است

اے خامہ وصفِ قامتِ معشوق کم نگار ‏ — ‏ اے دل سخن ز راستِ قدِ امی میار
قمری! ز ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار ‏ — ‏ واعظ! حدیثِ سایۂ طوبےٰ فروگذار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمد است

حکمش بمہر و ماہ روانست چوں قضا ‏ — ‏ دیدی کہ بازگشتنِ خورشید بر قفا
بودہ است بر اشارۂ ابروی مصطفےٰ ‏ — ‏ بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمد است

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود ‏ — ‏ ور آل و از صحابہ و امت سخن رود
واں کاینہ ز ختمِ رسالت سخن رود ‏ — ‏ درخور ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمد است

ہمت بمدحِ شہ من و حالی گماشتیم ‏ — ‏ گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم
چوں کام و لب فراخورِ وصفش نداشتیم ‏ — ‏ غالب ثناے خواجہ بیزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

بجز دو بوقتِ ذبح تپیدن گناہ من | دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

یاد و از عدو نیارم وا ینہم ز دوربینی ست | کاندر دلم گذشتن بادوست ہمنشینی ست

کہتا ہے میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا یہ دُوربینی کی بات ہے کیونکہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے اگر رقیب کا خیال دل میں آئیگا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہمنشیں ہوجائیگا۔

من سوی او بہ بینم داند ز بیحیائی ست | او سوی من نہ بیند دانم ز شرمگینی ست

چہ فتنہ ہا کہ در اندازہ گمان تو نیست | قیامتست اے دل دیر مہربانِ تو نیست

روان فدای تو نامم کہ بُردہ ناصح | زہے لطافتِ ذوقیکہ در بیانِ تو نیست

چونکہ ناصح ترک عشق کی نصیحت کرتا ہے اس لئے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے کہ میری جان تجھپر قربان ہو! تونے کسکا نام لیا؟ وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے؟ یعنی جس طرح اُسکا نام لینا چاہئے تھا اگر اُس طرح تو بھی وہ نام لیتا تو کیسی لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چونکہ ناصح نے بُری طرح سے اُسکا نام لیا تھا۔ اس لئے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

دل از خموشیِ لعلت امیدوار چراست | چہ گفتہ بزبانے کہ در دہانِ تو نیست

معشوق نے مُنہ سے کچھ نہیں کہا مگر اُسکی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اُسکے التفات یا وصل کی امید بندھی ہے پس کہتا ہے کہ تیرے لعل لب کی خاموشی سے میرا دل اس قدر کیوں امیدوار ہے تونے اُس زبان سے جو تیرے مُنہ میں نہیں ہے کیا کہدیا ہے جس سے اُسکو امید بندھی ہے۔

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی | بد است مرگ و لے بدتر از گمانِ تو نیست

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست	قعرِ دریا سلسبیل و روی دریا آتش ست

دوسرے مصرع میں عرفی کے مضمون کو اُلٹا ہے۔ اُسنے۔ اِس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے
راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آگ میں جل جانے سے
ہوتا ہے۔ یوں کہا تھا "روی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست" مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف
خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ دریا میں انسان جبھی تک بےچین رہتا ہے جب تک
کہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جب ڈوب گیا پھر کچھ بھی بےچینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا
چاہیے کہ "قعرِ دریا سلسبیل و روی دریا آتش ست"

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ	در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

جو لوگ شرابِ طہور کی امید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے اُسکو کل کیلیے
رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس اُن سے کہتا ہے کہ "پاک خور امروز" یعنی سب آج ہی نبیڑ دے اور کل کیلیے
مت رکھ۔ کیونکہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے اور کل وہی آگ ہو جاویگی۔

ز وہم نقشِ خیالی کشیدہ ورنہ	وجودِ خلق چو عنقا بدہر نایاب است
قوی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب	ندیدہ کہ سوی قبلہ پشتِ محراب است

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے تو پھر آدابِ ظاہری کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ دیکھو! قبلہ کی
طرف پشت کرنا ہر ایک کے لیے خلاف ادب ہے، مگر محراب مسجد جسکو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق
ہے۔ اُسکی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے۔

ہر چہ فلک نخواستہ است ہیچکس از فلک نخواست	ظرفِ فقیہ مے نجست بادۂ ناگزک نخواست

ظروف

بحث و جدال بجای ماں - میکدہ جوئی کا ندر لب — کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

بجائے ماں یعنی بجائے ، یعنی بحث و جدال کو یونہیں رہنے دے اور میخانے میں جاکر وہاں نہ جمل کا جھگڑا ہے نہ فدک کا قصہ ہے جمل سے مراد جنگ جمل ہے جسمیں حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہوکر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں ۔ فدک ایک کھجوروں کا باغ تھا جسپر حضرت سیدۃ النسا فاطمہ زہراؓ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعوے کیا تھا ، یہ دونو جھگڑے منجملہ اُن بیشمار نزاعوں کے ہیں جسپر سُنی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے ۔

فخریہ

دل جلوہ میدہد ہنر خود در انجمن — رحمے مگر بجانِ حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا اب علی الاعلان اپنے ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں گویا اب حاسد کی جان پر رحم باقی نہیں رہا ۔

مضامین عاشقانہ

غالبؔ باں بریدۂ داگندہ گوش نیست — آنا دماغ گفت و شنودش نماندہ است

بلبل بدولت بنالۂ خونیں بہ بند نیست — آسودہ زی کہ یار تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل تو اپنے نالہ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے ؛ جب چاہتی ہے نالہ کرتی ہے بس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گل مشکل پسند نہیں ہے ۔ بخلاف ہمارے کہ ہمکو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے ؛ حالانکہ نالۂ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے ۔

تصوف

بے خود بزیر سایۂ طوبے غنودہ اند — شبگیرِ رہروانِ تمنا بلند نیست ۔

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں انکا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے انکا منتہاے مقصود طوبے کے سایہ میں آرام کرنا ہے ۔

اختری خوشتر از نیم بجہاں می بایست — عزّ و پیر مرا بخت جواں می بایست

تا تنک مایہ بدریوزہ خود آرا نشود — نرخ پیرایۂ گفتار گراں می بایست

گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست — گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن بسی ست

مشکیں غزالہا کہ نبینی بہیچ دشت — در مرغزار ہاے خطا و ختن بسی ست

در صفحہ نبودم ہمہ آں چہ در دل ست — در بزم کمترست گل و در چمن بسی ست

در از دستی من چاکے ار فگند چہ عیب — ز بیش دلق ورع با ہزار پیوند است

نگفتہ کہ بہ تلخی لب از و پند پذیر — بروکہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

اگر نہ بہر من - از بہر خود عنہ یزم دار — کہ بندہ - خوبی او خوبی خداوند است

درگرم روی سایۂ و سرچشمہ نجوئیم — با ما سخن از طوبی و کوثر نتواں گفت

یعنی ہمکو آگے جانے کی جلدی ہے ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبی اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است — بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا — مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

گفتم ز کہ پرسم اثرِ عمر گذشتہ — ساقی بقدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

در قالبِ ملّا اثر ش پردہ کشا شد — خاکے کہ قضا در تن گم سالہ فرو ریخت

اگر نافق - وصل ناخوش در موافق - ہجر تلخ — دیدہ دا غم کرد روے دوستاں دیدن نداشت

یعنی دوستوں کا منھ دیکھنا اور اُنسے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیے تھا، کیونکہ جو منافق ہیں اُنکا ملنا ناگوار ہے

اور جو موافق ہیں اُن کی جدائی تلخ ہے۔

انسان

بُرد آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

یعنی بارِ امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اُٹھ سکا وہ انسان نے اُٹھایا گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لیئے اور جام آسمان کے لیئے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بارِ امانت جو انسان پر ڈالا گیا اُسکی تشبیہ اُس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے !!

بدیں نیاز کہ با تست۔ ناز می رسدم گدا بسایۂ دیوارِ پادشا خفت است

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

عمت بہ شہر شبیخوں زناں بہ بنگہ خلق عسس بخانۂ و شہ در حرم سرا خفت است

یعنی کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ حرم سرا میں آرام کرتے ہیں۔ اُنھیں کیا خبر ہے کہ تیرا غم یعنی عشق شہر میں خلقت کے گھروں پر شبخوں مار رہا ہے۔

ابہت

دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفت است

کہتا ہے کہ پارسا یعنی زاہد تو اس گھمنڈ میں کہ میں عبادت میں مصروف ہوں غافل ہے اور دزدِ مرحلہ جو منزلگاہ میں لگا ہوا ہے یعنی نفسِ امارہ جاگ رہا ہے، یعنی تاک میں بیٹھا ہے۔ پس مجھے سبحہ و سجادہ و ردائے زاہد کی خیر نہیں معلوم ہوتی، اِسلیئے میرا دل کانپ رہا ہے۔

شوق

ببیں ز دور و مجو قربِ شہ کہ منظر را دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفت است

قربِ درگاہِ الٰہی میں جو مشکلات و خطرات ہیں اُنکو بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ دُور ہی سے دیکھ لے

اور قرب کا طالب نہو۔ اگرچہ منزل کے پٹ کھلے ہوئے ہیں مگر دروازے پر اژدہا سوتا ہے۔

براہ خفتن ما ھمرہ کہ بنگرد داند | کہ میر قافلہ در کارواں سر آخفت است

کہتا ہے کہ میں منزل پہنچنے سے پہلے راہ ہی میں ایسا غافل و بے خبر سوتا ہوں جیسے کہ کارواں سالار منزل پر پہنچکر آرام سے پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہے۔

دگر زامنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ | مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفت است

قفس و دام را گناہے نیست | ریختن در نہاد بال و پر است

نہاد۔ جبلت کو کہتے ہیں۔ قفس اور دام دونو جانور کے لئے تکلیف اور اذیت کے مقام ہیں۔ جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مرجاتا ہے اور اسکے بال و پر گرجاتے ہیں۔ یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اسکی تکلیفات مراد ہیں۔ کہتا ہے کہ قفس اور دام پر کچھ الزام نہیں ہے بال و پر گرنے ہی کے لئے بنے ہیں اور جاندار مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند | ہم خزاں ہم بہار در گذر است

یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں۔ اُسمیں پتے جھڑتے ہیں تو اِسمیں پھول جھڑتے ہیں۔

بے تو گزیستہ ام سختی ایں درد مسنج | بگذر از مرگ کہ وابستہ ہنگامی ہست

یعنی موت کے لئے تو ایک وقت معین ہے اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں۔ بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیونکر رہا اور کیونکر جدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا۔

کیست در کعبہ کہ رطلے زنبیدم بخشد | در گروگاں طلبد جامۂ احرامے ہست

رطل پیمانۂ شراب۔ نبید۔ شراب۔ گروگاں وہ شے جسکو گرو رکھیں۔ جامۂ احرام وہ بن سلا کپڑا

جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

زبد رجستہ شرارو نہ بجا ماندہ رماد　　　سوختم۔ لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

رماد۔ راکھ۔ پہلا سوختم لازمی۔ دوسرا سوختم متعدی۔ کہتا ہے میں جل تو ضرور گیا مگر معلوم نہیں اسنے کس طرح مجھے جلا دیا، نہ کوئی پتنگا اڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام　　　داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

دوست کو حور سے۔ بادہ کو کوثر سے۔ اور خلوت کو دار السّلام یعنی جنّت سے تشبیہ دی ہے۔

دلخستہ غمیم و بود مے دواے ما　　　با خستگاں حدیث حلال و حرام چیست
(یعنی بیماراں و دردمنداں)

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را　　　تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

نیکی ز تست از تو نخواہیم مزدِ کار　　　ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

یعنی اگر ہمنے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے اسکی اُجرت ہم نہیں چاہتے اور اگر ہم بد ہیں تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں پھر سزا کس لئے ہے۔

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت　　　پرسد چرا کہ نرخ مئے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا پس اُسنے اُنکو اگر بیچ نہیں دیا تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے بہم فروخت کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونو کو یکساتھ نہ فروخت کیا ہوگا تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکیگی۔

لطفِ خدا ے۔ ذوق نشاطش نہ بیدہ　　　کافر دلے کہ با ستم دوست خو گرفت

یعنی وہ کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو اُسکو خدا کی مہربانی میں بھی مزا نہیں آتا۔ بظاہر

یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ایک نکتہ ہے جو ہوا و ہوس کے کوچے
میں ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ بوالہوس لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں، جدائی کے صدمے، رشک
کی جلن، ذلت و بے آبروئی، معاشیق کی بے التفاتی و بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں
مگر ہوا و ہوس سے باز نہیں آتے، اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعثِ خوشنودی خدا ہے
اسکو اختیار نہیں کر سکتے۔

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد | بے چارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

رموز دیں نشناسم درست و معذورم | نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی ست

یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے پس اگر اصولِ مذہب سے واقف
نہوں تو مجھکو معذور سمجھنا چاہیئے۔

نشاطِ جم طلب از آسمان نہ شوکتِ جم | قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی ست

دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی۔ یعنی انگوری شراب چاہیئے جس سے جمشید کا سا
عیش حاصل ہو یاقوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسر ہو
تو نہ سہی۔

بہ آنچہ در نگری جز بجنس مائل نیست | عیارِ بیکسیِ من شرافتِ نسبی ست

یعنی جسکو دیکھئے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافتِ نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے
اسلئے میری طرف کوئی مائل نہیں ہے، اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

نشاط معنویاں از شرابخانۂ رست | فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ رست

اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

بجام و آئنہ حرفِ جم و سکندر چیست — کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گذرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہان ما را — قدم بہ بتکدہ و سر بہ آستانۂ تست

یعنی تو جو تمام عالم پر پھیلا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدہ میں۔ مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر

سپہر را تو بتاراجِ ما گماشتۂ — نہ ہر چہ دزد ز ما برد در خزانۂ تست؟

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کرلے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست — نہ تیز گامیٔ توسن ز تازیانۂ تست؟

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے، اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کرکے عالمِ بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے۔

شبابِ ہد!! چہ ناقدردانیِ ہستی ست — بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد

آخرِ منزلِ نخست خوی تو راہ میزند — اولِ منزلِ دگر بوی تو زاد میدہد

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے تو لذتِ قرب حاصل ہونے لگتی ہے جو مثل زادِ راہ کے آگے بڑھنے کی

ہمت بند ہوا تی ہے۔

تصوف

اے کہ بدیدہ نم زتست و یکہ بسینہ غم زتست — تا زشش غم کہ ہم زتست خاطر شاد میدہد

تصوف

مست عطای خود کند ساقی ما نہ مستِ مے — دادہ ز یاد مے برد بسکہ زیاد میدہد

یعنی ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے چونکہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اس لئے پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں اُسکے احسان کے نشے پر شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا۔

اخلاق

دل اسبابِ طرب گم کردہ در بندِ غمِ ناں شد — ز راعتگاہِ دہقاں میشود چوں باغ ویراں شد

یہ مضمون مرزا کے حسبِ حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے اوّل عیش و عشرت اور پھر نون تیل لکڑی کی فکر زراعت اور باغ کی مثال کس قدر ممثل لہ کے مطابق واقع ہوئی ہے۔

ز ما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را — قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے وہ انسان ہی کے دم سے ہے اگر حضرت انسان نہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا۔

قضا از ذوقِ معنی شیرۂ میر یخت در جا نہا — نے از لائے پالائش چکید و آبِ حیواں شد

لائے پالا صافی کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

جلوہ اے داغ کہ ذوقِ تم ز نمک سے خیزد — مژدہ اے درد کہ نگم ز دوا مے آید

یعنی اے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آگیا کیونکہ نمک جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی

بانے کا باعث ہے مجھے اسمیں مزا آنے لگا ہے اور اے درد تیری بن آئی ہے کیونکہ مجھے
دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

ہمچو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیروں در بہاراں ہمہ بوئیت ز صبا مے آید

اس شعر میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ
ہے کہ اِنَّ لِرَبِّکُم فِی اَیّامِ دَہرِکُم نَفَحَات اَلا فَتَعَرَّضُوا لَہا۔

خوش است آنکہ با خویش جز غم ندارد ولے خوشتر ست آنکہ ایں ہم ندارد

سرابے کہ رخشد بویرانہ۔ خوشتر ز چشمیکہ پیرایۂ نم دارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے اُس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

سخن نیست در رِفعتِ این قطعہ غالب بہشتے بود ہند کا دم ندارد

قطعہ سے مراد قطعۂ زمین ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رُخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

سوخت آتشکدہ۔ ز آتش نفسم بخشیدند ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بُردند بہ سخن ناصیۂ فرِ کیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند ہر چہ بُردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

ہر چہ در جزیہ ز گبراں مئی ناب آوردند بشبِ جمعۂ ماہِ رمضانم دادند

هرچه از دستگهِ پارسی یغما بردند　　تا بنالم هم ازاں جمله زبانم دادند

اخیر کے چند شعروں میں اِس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے وقت عجم سے چھینا اُسکے عوض میں مجھکو۔کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں۔کچھ نہ کچھ دیا۔جب آتشکدہ جل کر راکھ ہوگیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔اور جب بتخانہ گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔شاہان عجم کے جھنڈوں کے موتی اُتار لئے اور اُسکے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔اِسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھکو شاعری میں اقبالِ کیانی مرحمت فرمایا۔پھر کہتا ہے کہ موتی تاج میں سے توڑ لئے اور علم و دانش میں جڑ دئے یعنی جو کچھ ملی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دیدیا۔اور آتش پرستوں سے جو شراب جزیے میں لی وہ ماہ رمضان کی شب جمعہ کو مجھے پلائی۔خلاصہ یہ کہ پارس کی جو کچھ پونجی لوٹی تھی اُمیں سے زبان مجھکو فریاد کرنے کے لئے دیدی۔

خوباں نہ آں کنند کہ کس را زیاں رسد　　دل بُرد۔تا دگر چہ ازاں دلستاں رسد

یعنی دل لیا ہے تو ضرور اُسکے عوض میں کچھ اُس سے وصول ہوگا؛ کیونکہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔

مقصودِ ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست　　هرجا کنیم سجده۔بداں آستاں رسد

گم شد نشانِ من چو رسیدم بہ کنجِ دیر　　مانندِ آں صدا کہ بگوشِ گراں رسد

شعرائے متصوفین دیر و خرابات و میکدے سے اکثر خانقاہ یا وہ مقام جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے مراد لیتے ہیں۔اپنا نشان دیر میں پہنچکر گم ہوجانے سے مراد فنا ہے۔اِسکی تشبیہ اُس صدا سے جو

بہرے آدمی کے کان تک پہنچکر گم ہوجاتی ہے کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

اعزاز نفس

دردام بہر دانہ نیفتم مگر قفس چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزاز نفس کا اظہار ہے۔ یعنی اگر عزت کے ساتھ قید کرو تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے۔ پس یہ امید نہ رکھو کہ میں دانے کے لالچ سے جال میں آپھنسونگا ؛ نہیں۔ بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہونچ جائے ؛ میں قفس میں فوراً چلا آؤنگا۔

عاشقانہ

تیر نخست را غلط انداز گفتہ ام اے واے گر نہ تیر دگر برنشاں رسد

غلط انداز اُس تیر کو کہتے ہیں جو خطا کرکے غیر مقصود جگہ جالگے چونکہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں اس لئے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اُسکا آکر لگا ہے مگر میں اُسکو اپنی نحوستِ طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اُسی جگہ آکر لگا تو میں سمجھونگا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا ورنہ میرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا صحیح ہوجائیگا اور امید بالکل باقی نرہے گی۔

امید غلبہ نیست بہ کیش مغاں درآے مے گر بہ جزیہ دست ندادار مغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی اُمید نہیں ہے تو انکا مذہب اختیار کرلے ؛ کیونکہ اس صورت میں اگر شراب جزیہ میں نہ آویگی تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آویگی۔ اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبہ کی اُمید نہو تو لاچار کیش مغاں اختیار کرنا چاہئے ؛ تاکہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ وارمغاں ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

عاشقانہ

جاں بر سر مکتوب تو از شوق نشاندن از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

آں کشتی شکستہ زموجم کہ تباہی   افگند در آتش گرازآبم بدر آورد

جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے تو اسکے تختوں کو پانی سے نکال کر آگ میں
ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے
سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔

گر جلوۂ رخ تو بہ ساغر ندیدہ ایم   چندیں بذوق بادہ دل از جا چہ میرود
ہفت آسیا بگردش و ما درمیان او   غالب دگر مپرس کہ برما چہ میرود
مجو آسودگی گمرو براہی کاندریں وادی   چو خار از پا برآمد۔ پا ز داماں برنمی آید

یعنی کسی حالت میں آدمی دنیا کے مخمصوں سے نجات نہیں پا سکتا اگر کانٹا پاؤں سے نکل گیا تو
پاؤں دامن میں الجھے گا۔

برآر از بزم بحث ای جذبۂ توفیق غالب را   کہ ترک سادۂ ما با فقیہاں برنمی آید

ترک سادۂ ما یعنی غالب جو کہ ایک بھولا بھالا ترک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور
فرہادِ من یعنی خود میں۔ با فقیہاں برنمی آید یعنی مولویوں کی دلیلوں اور حجتوں سے عہدہ برا نہیں
ہو سکتا۔ باکسے برنیامدن کے معنی ہیں اس سے سربرا اور عہدہ برآ ہونا۔

چشم و دل باختہ ام۔ داد ہنر خواہد داد   آنکہ چوں من ہمہ دان ہمہ بین تو شود

یعنی چونکہ میرے دل نے تجھکو جانا ہے جیسا کہ تو ہے اور میری آنکھ نے تجھکو دیکھا ہے جیسا کہ تو
ہے اس لئے دل اور آنکھ دونو کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دیگا جو میری
طرح تیرا ہمہ داں اور ہمہ بیں ہوگا۔

کفر و دین چیست جز آلایشِ پندارِ وجود　　　پاک شو پاک کہ ہم کفر تو ہم دین تو شود

رفتہ بودی دگر از جا بہ سخن سازیِ غیر　　　منت از بخت کہ خاموشیِ ما یاد آمد

یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے سپر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اسکی سخن سازی دیکھکر ہماری خاموشی تجھکو یاد آگئی جس سے تجھکو یہ خیال دا ہوگا کہ سچے عاشق منہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روی تو بود　　　چشم سوے فلک و روی سخن سوی تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا شکوہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھسے کر رہا تھا ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے۔

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند　　　کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروی تو بود

گر چنیں ناز تو آمادۂ یغما ماند　　　بہ سکندر نرسد ہر چہ ز دارا ماند

معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ سکندر سے مراد بادشاہ فاتح، اور دارا سے بادشاہِ مفتوح

ہم بسوداے تو خورشید پرستم آرے　　　دل ز مجنوں برد آہو کہ بہ لیلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے، جیسے مجنوں ہرن پر اس لئے فریفتہ تھا کہ انکی آنکھیں لیلےٰ سے مشابہ تھیں۔

شکوۂ دوست ز دشمن نتوانم پوشید　　　گر غم ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جا سکیگا یہ تک کہ اسکو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکونگا۔

در تغافل دشنہ ناں ساختہ غالب امروز　　　مگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

بستند رہِ جرعۂ آبے بسکندر — دریوزہ گرِ میکدہ صہبا بکدو برد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور میکدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا بھر کر لے گیا مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو میکدے یعنی خانقاہ کے ادنےٰ گداؤں کو نصیب ہے۔

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دہ — تا تلخیِ آں زہر توانم بہ گلو برد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کروں تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اُس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ روکر حلق سے دور کروں۔

ز جوشِ شکوۂ بیداد دوست می ترسم — مبادا مُہرِ سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے مطلب تو یہ ہے کہ اُسکے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اُسکو ضبط نہ کرسکوں مگر اُسکو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُسکی بیداد کا شکوہ دل سے اِس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ مُنھ پر جو مُہرِ سکوت لگی ہوئی ہے کہیں اُسکے ریلے میں بہ نہ جائے۔

بُریدہ ام رہِ دورے کہ گر بیفشانم — بجاے گرد رواں از بدن فرو ریزد

یعنی میں نے ایسی راہ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے۔ یہ تمثیل ہے اُس محنت و مشقت کی جو فکرِ شعر اور تکمیلِ فنِ سخن میں قائل نے کی ہے۔

مکن بپرسشم از شکوہ منع کایں خوے ست — کہ خود ز زخمِ دمِ دوختن فرو ریزد

عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ ٹھیک ہے۔ قاعدہ ہے

کہ جب معشوق مہربان ہو کر عاشق کی پرسشِ حال کرتا ہے تو اُسوقت عاشقِ مہجور کا دل بھر آتا ہے، اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پرسشِ حال کے وقت شکایت سے مجھکو منع نہ کر، کیونکہ تو جو پرسش حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے، اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے۔

مغ

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد　　　زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

یعنی عمر کا سفر میں گذرنا نہایت عمدہ ہے بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گذرے اُسپر انسان فریفتہ نہ ہو جایا کرے۔

عاشقانہ

بوصل لطف باندازۂ تحمّل کن　　　کہ مرگِ تشنہ بود آب چوں ز سر گذرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اِس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اُسکی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے مارے مرجاؤں، کیونکہ پیاسے کے لئے وہ پانی موت ہے جو سر سے گذر جاے۔

تصوف

ہر کجا دشنۂ شوقِ تو جراحت بارد　　　جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد

طوبیِ فیضِ تو ہر جا گل و بار افشاند　　　جز نسیمے بہ پرستش گہِ مریم نرسد

جگر گوشۂ ادہم یعنی ابراہیم بن ادہم۔ کو اُن زخموں میں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی۔ اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں اُنمیں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محرابِ مریم تک پہنچا ہے۔

شوخی

مے بہ بزمِ ہا دگمن عرض کہ ایچ ہر نابِ　　　پیشِ ایں قوم بہ شور آبۂ زمزم نرسد

خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد　　　وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے موقع پر اُردو میں تیسرے شخص کے لئے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلبگار ہیں۔ بڑا مزا ہو اگر آپ کا سلسلۂ نسب آدم تک نہ پہنچے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا کو یہ احتمال ڈارون کی تھیوری کے موافق سوجھا ہوگا، شاید انکا یہ مطلب ہے کہ آپکے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہوں۔

جاں در غمت فشاندن مرگ از قفا ندارد　　　تن در بلا فگندن بیم بلا ندارد

چوں لعلِ تست غنچہ اما سخن نداند　　　چوں چشمِ تست نرگس اما حیا ندارد

فارغ کسیکہ دل را با درد وا گزارد　　　کشتِ جہاں سراسر داروگیا ندارد

با ید زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند　　　آرے دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

کو فنا تا ہمہ آلایشِ پندار برد　　　از صُوَر جلوہ و از آئینہ زنگار برد

عشوۂ مرحمتِ چرخِ مخور کایں عیار　　　یوسفؑ از چاہ برآرد کہ ببازار برد

عشوہ خوردن دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نآنا کہ یہ عیار یوسفؑ کو چاہ سے اِس لئے نکالتا ہے کہ بازار میں لیجا کر بکوائے۔

ہر شیشے را نشاطے در خور است　　　بوے پیراہن بہ کنعاں می رود

جوہرِ طبعم درخشان است لیک　　　روز م اندر ابر پنہاں می رود

نومیدیِ ما گردشِ ایام ندارد　　　روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

بلبل بچمن بسنگ و پروانہ بمحفل　　　شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں، اسی لئے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے۔ اور نہ پروانے کو شمع کی ہمدلی میں قرار ہے۔

چہ خیزد از سخنے کز درون جاں نبود　　　بُریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کٹیو وہ زبان جو خونچکاں یعنی درد دل سے بھری ہوئی نہو۔

حکیم ساقی و مے تند۔ و من زبدخوئی　　　ز رطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نبود

حکیم سے مراد خدا ہے کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولت دنیا نہایت تند ہے مگر میں اپنی بدخوئی اور زیادہ طلبی سے اگر شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں تو غصے ہوتا ہوں۔

ز خویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم　　　کہ باز گردم و جز دوست ارمغاں نبود

قاعدہ ہے کہ جب آدمی کہیں سفر کو جاتا ہے تو وہاں سے کچھ سوغات وہدیہ و ارمغاں لیکر وطن میں واپس آتا ہے کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو جا چکا ہوں اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے آپے میں آؤں تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لیکر نہ آؤں۔

زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است　　　بسوے قیس گرایش ز ساربان نبود

یعنی لیلی کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اسوقت اُسکی باگ تصرفِ شوق قیس کے ہاتھ میں ہے وہ جدھر چاہتا ہے لیجاتا ہے۔

بتانِ شہر ستم پیشہ شہریار انند　　　کہ در ستم روش آموزِ روزگار انند

برند دل بادائے کہ کس گماں نبرد   فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار آمد

نہ زرع و کشت شناسند نے حدیقہ و باغ   ز بہر بادہ ہوا خواہ باد و باراں اند

یعنی ہوا اور مینہ کچھ اس لئے نہیں چاہتے کہ اُس سے کھیتیاں اور باغ سرسبز و شاداب ہونگے بلکہ صرف اسلئے کہ شراب پینے کا لطف بغیر باد و باراں کے نہیں آیکا۔

یہ مضمون مرزا کو کہیں سے تلاش کرنا نہیں پڑا، بلکہ یہ خاص اُنکی طبیعت کا اقتضا تھا جس مکان میں مرزا رہتے تھے اُسکے دروازے پر ایک کمرہ تھا، اور کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جسکے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمدہ گذرگاہ سے تقریباً چار گز اونچا ہوگا۔ ایک روز مینہ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ابر و باراں کی مدارات میں مصروف تھے۔ اُس وقت عالم سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا ہے ایسا برسے کہ گلی کی رو کا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر کر پانی پیوں۔ کسی نے کہا حضرت! برآمدے تک پانی آگیا تو شہر پہلے ڈوب جائیگا۔ مرزا ہنسکر چپکے ہو رہے۔

چہ لطف رہروی آنرا کہ خار خاری نیست   مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد

خار خار خلجان۔ کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہو سفر میں کچھ لطف نہیں۔ بس اگر کعبہ کی راہ پُرامن ہے تو کعبے جانا نہیں چاہئے۔ فی الحقیقۃ جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں طے کرکے مقام مقصود تک پہنچتے تھے۔ جو خوشی اُنکو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہوگی اُسکا سواں حصہ بھی اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا جو ریل اور اسٹیمر میں آج کل سفر کرتے ہیں۔

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے   غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے؛
اور اُسنے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اُسکی
زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر۔ کچھ تو اس لئے کہ کسی کو اپنا قدر دان
اور پایہ شناس نہیں پاتا، اور کچھ اِس لئے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو
نہیں دیکھتا۔ اپنے تئیں غریبِ شہر یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو
بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں۔ جو کہنے ہی کے لائق ہیں۔ کہنی چاہتا ہے۔

پشیم ازاں بپرس کہ پرسی وا ہلِ کوے ۔۔۔ گویند خستہ زحمتِ خود زیں دیار بُرد
نازم فریبِ صلح کہ غالب زکوے تو ۔۔۔ ناکام رفت و خاطرِ امیدوار بُرد
ہر کہ ارخت نمازے بنود از نمِ مے ۔۔۔ جاے در حلقۂ رندانِ قدح نوش مباد

جامہ یا رخت کا نمازی ہونا اُسکے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

مُغتیاں! بادہ عزیزست۔ مریزید بخاک ۔۔۔ جوشد از پردہ دگر خونِ سیاوش مباد

دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے "مباد اخونِ سیاوش۔ دیگر از پردہ بجوشد۔ سیاوش کا قصہ
مشہور ہے کہ وہ بیگناہ اپنے سسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا؛ اور اُسکے خون کے وبال
میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مغنیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے؛ اسکو
زمین پر مت گراؤ؛ ایسا نہو کہ خونِ سیاوش پھر جوش مارے۔

اندر شکر کرد آنچہ بمن روزگار کرد ۔۔۔ در خستگی نشاطِ مرا دید۔ خوار کرد

یہ غزل غالباً اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں پھنس گئے تھے۔ یعنی

نے نے جب مجھکو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے تو مجھے ذلیل و خوار کر دیا کہ اب خوش نہ رہیگا۔

در دل ہمی ز بینش من کینہ داشت چرخ — چوں دید کاں نماند نہاں۔ آشکار کرد

نی میری دانش و بینش کے سبب مجھسے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا۔ اب جو دیکھا کہ وہ کینہ

دں پر ظاہر ہو گیا ہے تو آسمان کھل کھیلا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

لنگر گسست و صرصر و کشتی شکست موج — دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

نی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ہوا۔

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر — نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

عل شعر کا یہ ہے کہ در حقیقت میں ہوں تو نا امید مگر چونکہ تجھسے نا امید ہونا کفر ہے اور تو کفر سے

ہی نہیں اس لئے مجبوراً اپنے تئیں امیدوار بنایا ہے۔

بشرع آویز و حق میجو ز مجنوں کم نۂ بارے — دلش با محمل است۔ اما زباں با سارباں دارد

نی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈھ۔ آخر تو مجنوں سے تو کم نہیں ہے کہ اسکا دل تو محمل

س اٹکا ہوا ہے مگر زبان کو ساربان سے سروکار ہے۔ یعنی ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور

س لیلی سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور یہ نہایت

یغ تمثیل ہے اور شعر نوادرِ افکار سے ہے۔

خدارا وقت پرسش نیست گفتم۔ بگذر از غالب — کہ ہم جاں بر لب و ہم داستاں بر زباں دارد

تم یعنی میں نے کہدیا ہے، یا میں کہے دیتا ہوں۔ کہ یہ پرسش کا وقت نہیں ہے، تو غالب کے

ال سے درگذر اور پرسش کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ اسکی جان لبوں پہ ہے اور داستان زبان پہ

مبادا وہ اپنی درد انگیز داستان بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اُسکی جان بھی نکل جائے۔

گویند صنعان توبہ کرد از کفر۔ نادان بندہٴ   کز خود فروشیہای خویش بخشش ز یزداں خوش نکرد

صنعاں کا قصہ مشہور ہے جو پہلے عابد تھا پھر فسق و فجور میں مبتلا ہوگیا یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچ گئی پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعاں کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے۔ وہ عجب نادان بندہ ہے جسنے دین کی خود فروشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نکرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اُسکو بخش دیتا، اور اب جو وہ بخشا جائیگا تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی پس گویا اُسنے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا۔ خوش کردن کے معنی ہیں پسند کرنا۔

آں خود بہ بازی مے برد۔ دیں را بجوئی نشمرد   بنمودش دیں خندہ زد۔ آوردش جاں۔ خوش نکرد

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر   ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

میاویز یعنی مجھسے جھگڑا مت کر۔ فرزند آذر را ابراہیم علیہ السلام۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضمون ہی نہیں ہے بلکہ مرزا کے حسب حال بھی ہے، کیونکہ۔ جہاں تک ہمکو معلوم ہے۔ مرزا کے والد سنی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

در ستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست   آں کہ چندیں تکیہ بر حلم خداوندش بود

کہتا ہے کہ اُس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ہے جسکو خدا کے حلم پر اسقدر بھروسا ہے کہ اُسکے بھروسے پر ظلم کئے چلا جاتا ہے، اور اُسکے مواخذے سے نہیں ڈرتا۔

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی بازگوے   گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

بہرِ خواری بسکہ سرگرم تلاشم کردہ اند   پایۂ نزدیک در ہر دور باشم کردہ اند

دور باش۔ ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں۔ جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔
کہتا ہے کہ مجھکو جو قضا و قدر نے سرگرم تلاش کیا ہے اُس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے۔ پس
راہِ تلاش میں جو دھکا مجھپر پڑتی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے؛
اور اس طرح جو امر میرے سرگرم تلاش کرنے سے مقصود ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر دور باش پر
میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

چرخ ہر روزم غم فردا بجز دون میدہد   تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند
از چہ غالب خواجگیہای جہان ننگ منست   گر نہ با سلمان و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند
بخشم نا سزا میگوید و از لطف گفتارش   گماں دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید

لطفِ گفتار کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرائے میں نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے کہ معشوق غصے میں برابر
مجھکو برا بھلا کہتا ہے؛ مگر اُسکے لطف کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات
کہتا ہے، اب کوئی مہربانی کا کلمہ اُسکی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پہلو برون آرم جمشید جام خود انگارد   وگر لختے بر افشانم سلیمانش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اُسکو پہلو سے نکالکر دکھاؤں تو جمشید اُسکو اپنا جام جہاں بیں سمجھے؛ اور اگر
اُسکا ایک لختہ نکالکر ڈال دوں تو سلیمان اُسکو خاتمِ سلیمانی کا نگیں بتائے۔

من بہ وفا مردم و رقیب بدر زد   نیمہ لبش انگبین و نیمہ تبرزد

بدر زد یعنی نکل بھاگا۔ تبرزد۔ مصری۔ کہتا ہے کہ میں تو نباہ کرتا کرتا مر گیا اور رقیب نکل بھاگا۔ گویا

معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ مَیں اُسمیں پھنس کر رہ گیا؛ اور آدھا مصری تھا کہ قریب اُسکے اُڑ گیا۔

دعوے اورا بود دلیل بدیہی　　　　خندۂ دنداں نما بحسن گہر زد

کتنے بڑے خیال کو کِن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اِس طرح ہنسا کہ اُسکے دانت نظر آنے لگے بس اُسکا خندہ گویا اِس بات کا دعوے ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں؛ اور اِس دعوے کی دلیل اُسکا خندۂ دنداں نما ہے؛ کیونکہ اُسکے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا یہی اِس بات کی دلیل ہے کہ موتی اُسکے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ بس اُسکے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے۔

نہم جبیں بدرش آستاں بگرداند　　　　نشنیمش بہ سرِرہ عناں بگرداند

آستاں بگرداند یعنی چوکھٹ کے پتھر کو اُلٹ کر اوپر کا رُخ نیچے اور نیچے کا رُخ اوپر کر دیتا ہے۔

تو نالی از خلش خار و تنگری کہ سپہر　　　　سرِ حسینؑ علی بر سناں بگرداند

برو۔ بشادی و اندوہ دل منہ۔ کہ قضا　　　　چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند

یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند　　　　کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند

تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد　　　　شوخی ز حد گذشت زبانم بریدہ باد

اوّل یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اُتر جائے۔ پھر یہ سمجھکر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گذر گئی میری زبان قلم ہو جیو۔

گر رفتہ ام ز کوے تو آساں نرفتہ ام　　　　ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد

ذوقیست ہمدمی لفتاں۔ بگذرم زرشک　　　　خار رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

یعنی اگر چہ تیرے عشق میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں! مگر چونکہ کئی آدمیوں کے ملکر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے اس لئے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ”خار بست بپائے عزیزاں خلیدہ باد“

در تیغ زدن منت بسیار نہادند — بُردند سراز دوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اتار کر بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سر اتارا ہے۔

روزیکہ بہ مے زور و بہ نے شور نہفتند — اندیشہ بکارِ خرد و ہوش نکردند

یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا درد۔ دونو عقل و ہوش کے دشمن ہیں۔ پس جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نے میں شور ودیعت کیا تھا اُس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تاجرِ شوق بداں رہ بتجارت نرود — کہ رہ انجام و سرمایہ بغارت نرود

یعنی شوقِ الٰہی کا تاجر اُس رستے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے اور اُس رستے میں سرمایہ لُوٹا نہ جائے۔

رمز نشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد — محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی کائنات کی ادنےٰ سے ادنےٰ چیز میں ایک ادا۔ یعنی ایک معنی یا راز چھپا ہوا ہے۔ پس ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہیئے! کیونکہ محرمِ راز وہی شخص ہے جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اُٹھاتا یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اُسکے موافق عمل کرتا ہے۔ کھانے میں، پینے میں،

سونے میں، جاگنے میں؛ غرضکہ ہر کام اور ہر چیز میں تیری ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔

زاہد از حورِ بہشتی بجز ایں نشناسد   کہ شود دستِ زدِ شوق بکارت نزود

دست زدِ شوق ہونا یعنی شوق کے زیرِ مشق ہونا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ زاہد شریعت کے تمام الفاظ کے انکے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ و کنایہ پر محمول نہیں کرتا۔

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر   چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ۔ اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اُسکو دیکھ۔ اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تمنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ "میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں"۔

زمن بجرمِ طپیدن کنارہ مے کردی   بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد   در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کیلئے ڈالا تھا وہ اُگا اور بڑھا، اور یہاں تک بڑھا کہ اسمیں گھونسلے بنگئے، مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

اے ذوقِ نواسنجی بازم بخروش آور   غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور

گر خود بجہد از سر از دیدہ فرو بارم   دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ دانی رہِ ویرانہ   شمعے کہ نخواہد شد از بادِ خموش۔ آور

ویرانہ یعنی غریب خانہ۔ جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب۔

شورابۂ ایں وادی تلخ است اگر رادی   از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

ے کہیں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے اے ہمدم فرزانہ اگر تو فیاض ہے تو شہر سے
ے لئے سرچشمۂ نوش یعنی شراب لا۔

دانم گذرے داری - ہر جا گذرے داری — مے گرند ہر سلطاں از بادہ فروش آور
گر مُغ بہ کدو ریزد برکف نہ وراہی شو — ور شہ بسبو بخشد بر دار و بدوش آور

ے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے؛ اگر بادشاہ عطا کرسکتا تو فبہا۔
باده فروش سے لا۔ اگر مُغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تو نبے میں ڈالدے تو تو نبا ہاتھ میں
لیلے۔ اور جو بادشاہ گھڑا بھر کر عنایت کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ۔

ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل — آں در رہ چشم افگن ایں از پے گوش آور

ں-راگ-آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قلقل۔

گاہے بسبکدستی از بادہ ز خویشم بر — گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

بسبکدستی یعنی کبھی جلدی سے مجھکو شراب پلا کر مدہوش کردے اور پھر جب میں بدمست
ں تو مجھکو گانا سنا کر ہوشیار کر۔

غالب- کہ بقایش باد- ہمپائے تو گر باید — بارے غزلے، فردے، زاں موئنہ پوش آور

ے تو یعنی ہمراہِ تو- موئنہ پوش اونی کپڑے پہننے والا- مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے
اکثر اونی یا پشمینے کا جبہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے۔

یقینِ عشق کن و از سرِ گمان برخیز — بآشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز
چرا بہ سنگ و گیاہ پیچی اے زبانۂ طور — ز راہِ دیدہ بدل در رو و ز جاں برخیز

زبانہ شعلہ وہ تجلی جو سنگ وگیاہ - یعنی کوہ طور اور نخل ایمن - پظاہر ہوئی تھی اُسکی طرف خطاب
کرتاہے کہ اے شعلۂ طور ! پتھر اور درخت سے - جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں کیوں لپٹتا ہے ؟ ہماری آنکھ
کی راہ سے دل میں اُتر اور رجان سے بھڑک اُٹھ ۔

عیادت است نہ پرخاش تندخوئی چیست ؟ بیا و ، غمزدہ بنشین ، ولب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا ہے اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھکر بے لطف ہوا ہے اُس سے کہتا ہے
کہ تو عیادت کے لیئے آیا ہے ، لڑائی کے لئے نہیں آیا ! پھر یہ تندخوئی اور بد مزاجی کیسی ہے ؟ بیار
آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے ؟ پس آ - اور مغموم بیٹھ - اور ہونٹ کاٹتا ہوا اُٹھ ۔

نفس چون بون گردد دیو را بفرماں گیر محرمِ سلیمانم نقشِ خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہوگیا پھر جن کو محکوم کرلینا آسان ہے - میں سلیمان کا محرمِ راز ہوں ، انکی
انگوٹھی پر یہی نگیں کندہ تھا جس سے تمام جن اُنکے محکوم تھے ۔

بوسہ از لبانم دہ ، عمرِ خضر از من خواہ جامِ مے بہ پیشم نہ ، عشرتِ جم از من پرس
وردِ من بود غالب ، یا علی بوطالب نیست بخل باطالب ، اسمِ اعظم از من پرس

کہتا ہے کہ میرا وظیفہ یا علی ابنِ ابی طالب ہے ، مجھکو طالبِ صادق سے کچھ بخل نہیں ہے ، اسمِ اعظم
مجھسے پوچھ لے کہ یہی "یا علی" اسمِ اعظم ہے ۔

لطفِ بجتِ ہر نگہ خشمگیں شناس آرایشِ جبینِ شگرفان زچیں شناس
بے غم نہادِ مرد گرامی نمے شود زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس

زنہار کے معنی یہاں ضرور ، بالضرور کے ہیں - یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں

اور جب امر پر آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

دود سودائے تتق بست، آسماں نامیدمش | دیدہ بر خواب پریشاں زد، جہاں نامیدمش

دنیا و مافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دُھواں اُٹھکر شامیانہ سا بنگیا ہمنے اُسکا نام آسمان رکھ لیا۔ اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا اُسکو جہاں سمجھ گئے۔ اِسی طرح اِسکے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضموں کی تفصیل ہے۔ مثلاً

وہم خاکے ریخت در چشمم، بیاباں دیدمش | قطرۂ بگداخت، بحرِ بیکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش، نوبہاراں خواندمش | داغ گشت آں شعلہ، از مستی خزاں نامیدمش

چونکہ نوبہار میں تمام جذباتِ نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے، اس لئے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے آگ کو دامن سے سُلگایا میں نے اسکو بہار قرار دیدیا۔ اور جب وہ شعلہ جل بجھا تو میں نے اُسکا خزاں نام رکھدیا۔

غربتم ناسازگار آمد، وطن فہمیدمش | کرد تنگی حلقۂ دام، آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہنچنے لگیں تو میں اُسکو وطن سمجھا؛ گویا جب دام کے حلقہ نے تنگی کی تو میں اُسکو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اس قدر بے مہری اور مغائرت لوگوں سے دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھکو راس نہ آیا تو میں نے اُسکو بھی وطن ہی تصور کرلیا۔

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش | رفت از شوخی بہ آئینے کہ جاں نامیدمش

یہاں بود کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکیں کے ساتھ بیٹھا تھا جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے۔ اور وہ شوخی سے اُٹھکر اس طرح چلا گیا کہ میں اُسکو

جان کہ آشنا یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے وہی اُسکے جانے سے ہوئی۔

مل زباں را رازدان آشنائیما نخواست	گاہ بہماں گفتمش گاہے فلان نامیدمش
در سلوک از ہرچہ پیش آمد گذشتن داشتم	کعبہ دیدم نقش پائے رہروان نامیدمش
دل در غمش بسوز اگر جاں میدہد عوض	در جاں دہی سنگے بہ ازاں میدہد عوض
نبود سخن سرائی ما رائگاں۔ کہ دوست	دل می برد زما و زباں میدہد عوض

کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہمکو مفت نہیں ملی ہے؛ بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اُسکے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقۃ جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی؛ خواہ عشق مجازی ہو اور خواہ عشق حقیقی۔

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ	ترا کہ ہست و نیا شامی از بہار چہ حظ
خوش ست کوثر و پاکست بادہ کہ در وست	ازاں رحیق مقدس درین خمار چہ حظ
چمن پُر از گل و نسرین و دلربا نیست	بدشتِ فتنہ ازیں گرد بے سوار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسرین سے مراد دنیا ہے؛ اور دلربا سے مراد وہ ذات بے نشان ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں۔ جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ اس گرد بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو

✤ بہماں اور فلاں دونو مرادف یکدگر ہیں جب کسی کا نام مراد نہیں لینا ہوتا تو وہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اردو میں ایسے موقع پر وہ یا وہ شخص یا اُنکا ڈھمکا بولتے ہیں ۱۲

تصوف

خطرہ ہوتا ہے اور اسکی کمک کے لئے کوئی سوار آتا ہے تو اول گرد نظر آتی ہے، پھر سوار نمودار ہوتا ہے مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا　　　ز میوہ تا نہ فتد خود ز شاخسار چہ حظ

یعنی جبکہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لئے پتھر ناپید ہیں تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے۔ یعنی جب تک جاذبہ عنایت ہمکو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہد حقیقی خود اپنی جھلکی نہ دکھائے۔ ہمکو کیا فائدہ؟

نہ مرا دولت دنیا۔ نہ مرا اجر جمیل　　　نہ چو نمرود توانا۔ نہ شکیبا چو خلیل

بنہ و بار بہ شبگیر در افگندہ براہ　　　آنکہ دانست سرائیگی صبح رحیل

بنہ و بار۔ ساز و سامان۔ شبگیر پچھلی رات۔ یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سرے پر ڈال دیتا ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را　　　اے بہ ترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل

یہ خطاب ہے خدا کی طرف۔ معنی ظاہر ہیں۔

غالب خستہ جاں را چہ بگفتار آری　　　بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

ندانند نظیری ز قتیل یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے۔

بسکہ پیچید بہ خویش جادہ ز گمراہیم　　　رہ بہ درازی دہد عشوہ کوتاہیم

ایک معقول بات کو محسوسات کی تمثیل میں ظاہر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ طریق معرفت میں

نابلد ہیں، یا یوں کہو کہ اس رستے میں گمراہ ہیں، وہ معرفتِ الٰہی کو اس قدر دشوار نہیں سمجھتے جس قدر کہ عرفا اور کُمّلِ اولیا سمجھتے ہیں۔ اس مطلب کو یوں بیان کرتا ہے کہ میری گمراہی کی شامت سے راہ اپنے اوپر اس طرح بل کھاتی ہے جس طرح رسّی یا ڈورا زیادہ بل کھانے سے چھوٹا ہو جاتا ہے پس وہ یعنی راہِ معرفت باوجودیکہ بہت دور و دراز ہے مجھکو کوتاہی کا عشوہ یعنی فریب دیتی ہے۔

شعلہ چکد زیں کرا - گل شگفد مزد کو؟   شمعِ شبستانیم - بادِ سحرگاہیم

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اُس پر لوگوں کی بیدردی اور ناقدردانی ظاہر کرتا ہے کہتا ہے کہ میں گویا شمعِ شبستانی ہوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے ہیں مگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی نہیں۔ اور گویا میں بادِ سحرگاہی ہوں جو پھول کھلاتی ہے مگر اُسکی اُجرت کوئی نہیں ادا کرتا۔

از صفِ طفلان و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ   زود ز کو نگذرد کوکبۂ شاہیم

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے جلد نہیں گزرتی کیونکہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے پتھراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔

جذبۂ تو باید قوی کاں برد - بال نیست   گر نتواند رسید بخت بہمراہیم

کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہئے جو مجھکو منزل تک لیجائے۔ پس نصیب اگر میرے ساتھ نہ چل سکے تو کچھ حرج نہیں۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس   ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

بر لبِ یا علی سرائے - بادہ روانہ کردہ ایم   مشربِ حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

روانہ کردہ ایم یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چونکہ لب پر یاعلی جاری ہے اس لحاظ سے تو ہمنے مذہب حق اختیار کیا ہے۔ اور چونکہ اُسپر شراب جاری ہے اس لحاظ سے مغوں یعنی آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں یعنی دنیا اور دین دونو ہمکو حاصل ہیں۔

بادہ بوام خوردہٗ و زر بقمار باختہ ۔ وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بسزا نکردہ ایم

یعنی شراب پینا اور روپیہ ضائع کرنا تو برا تھا ہی ہمنے ان برائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ نہ کیا شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھویا تو جوئے میں۔

نالہ بلب شکستہ ایم۔ داغ بدل نہفتہ ایم ۔ دولتیان ممسکیم زر بخزانہ کردہ ایم

نالہ بلب شکستہ ایم یعنی اُسکو منھ سے نہیں نکلنے دیتے، اور ضبط کرتے ہیں، اور داغ کو دل میں چھپائے رکھتے ہیں، ہم دولتمند تو ہیں مگر خسیس ہیں اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں۔

گر فراموشی بفریادم رسد۔ وقتست وقت ۔ رفتہ ام از خویشتن چندانکہ در یادِ خودم

کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو گزر گیا ہوں مگر ابھی آپنے کو بھولا نہیں ہوں اگر فراموشی اسوقت میری فریاد کو پہنچے اور آپنے کو بھلا بھی دے تو بہت مناسب ہے۔

ہر قدم لختے ز خود رفتن بود در بارِ من ۔ ہمچو شمع بزم در راہِ فنا زادِ خودم

کہتا ہے کہ راہِ فنا میں جو کچھ کہ میرے بار یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے وہ صرف یہی ہے کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہِ فنا میں آپ ہی اپنا زادِ راہ ہے۔ کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زادِ راہ کی طرح نبڑتی جاتی ہے۔ یہی طرح میں بھی آپ اپنا زادِ راہ ہوں۔

یاد باد آں روزگاراں کاعتباری داشتم | آہِ آتش ناک و چشمِ اشکبارے داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ جبکہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتشناک تھی اور آنکھ اشکبار۔

دیگر از خویشتنم خبر نبود۔ تکلف برطرف | ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ایں چہ شورست کہ از شوقِ تو در سر دارم | دلِ پروانہ و تمکینِ سمندر دارم

آں چرا در طرب۔ ایں ز چہ در تعب است | خندہ بر غفلتِ درویش و توانگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش اور توانگر دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جبکہ دنیا کا طرب و تعب دونوں ہیچ ہیں تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیدہ کس لیے ہے؟

راز دارِ تو و بدنام کنِ گردشِ چرخ | ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو مجھے تکلیف پہنچتی ہے اُسکی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں، مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ پس در حقیقت تیرا احسانمند ہوں مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار۔

خوشنودم از تو و ز پئے دورباشِ خلق | آوازۂ جفائے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھکو جفاکار اس لئے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے ورنہ میں در حقیقت تجھسے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔

دوزند گر بفرض زمیں را بہ آسماں | حاشا کزیں فشار در ابرو خم افگنم

ہم بعالم ز اہلِ عالم برکنار افتادہ ام | چوں امامِ سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

زمن حذر نکنی گر لباسِ دیں دارم | نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریاکار لوگ ہیں جنکو تشرع اور تقدس بھگا رنکے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رندمشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے؛ مگر انکو ذرا ٹٹول کر دیکھئے تو وہ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے جو نوعمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے۔

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ ہنوز هزار وزد به هر گوشه در کمین دارم

ہنوز کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اردو میں "تاہم" یا "باوجود اسکے" بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چراتے ہیں۔ میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

ز وعدہ دوزخیاں را فزوں نیاز ازند توقعے عجب از آہ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعاد معین سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھینگے؛ پس اس خیال سے میں اپنی آہ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں؛ یعنی یہ کہ آہ آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی اس توقع کو عجیب اس لئے کہا ہے کہ اسکو بھی دوزخ پر قیاس کرکے اس سے آخر کار نجات کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

"دوسرا مصرع نظیری کا ہے۔ جس کا پہلا اصل مصرع یہ ہے "رہا بہ سادہ دلیہائے من توان بخشید" نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے؛ مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا کیا ہے گویا اسکو

چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہوگیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی تھی تو خطا مگر میں نے ایسی ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اس خطا پر آفریں کا امیدوار ہوں۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم   قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تا کہ آسماں کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم تم دونوں ملکر پلٹ دیں: اور حکم قضا کو رطل گراں یعنی جام شراب کی گردش سے پھیر دیں

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم   بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

در فراز کنیم یعنی دروازہ بند کر دیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اور کسیکو آنے نہ دے۔

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم   وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم (یعنی نندیشیم)   وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے برہگذر پاشیم   مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم   بکار و بار زنے کارداں گردانیم

گہے بلابہ سخن با ادا بیامیزیم   گہے ببوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لابہ۔ تملق و خوشامد سخن کو ادا کے ساتھ ملانا راز چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم   بشوخیے کہ رخِ اختراں بگردانیم

ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم   بلائے گرمیِ روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دو تو ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں، اور اسکو طلوع نہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہاں سے ٹالدیں۔

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم — ز نیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈال دیں۔ یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت آدھے رستے سے شہر کی طرف اُلٹا پھیر دیں۔

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را — تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں اُنکو ہم باغ کے باہر ہی سے خالی جھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بصلح بال فشانانِ صبحگاہی را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آ کر کلیل کرتے ہیں اُن کو نرمی اور پچکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

ز حیدریم من و تو۔ زما عجب نبود — گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے کہ ہم تم حیدری ہیں، ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقولِ بعض حیدر کرار سے معجزۂ ردالشمس ظاہر ہوا تھا۔ ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

رفت بر ما آنچہ خود ما خواستیم — وایہ از سلطاں بغوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے تو اُسکو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے۔ کہتا ہے کہ ہم پر جو سختی گذری وہ خود ہمنے ہی چاہی تھی، کیونکہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت غل شور بہت کیا، اس لئے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالےٰ ہے۔

دانش و گنجینہ پنداری یکیست حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیزیں ہیں؛ کیونکہ جو چیز ہمنے علانیہ مانگی۔ یعنی دولت۔ وہ خدانے ہمکو پوشیدہ طور پر دی۔ یعنی علم و ہنر

رفت و باز آمد ہما در دام ما باز سر دادیم و عنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا پھر آن پھنسا؛ اب چاہیئے تھا کہ اسکی زیادہ نگرانی کرتے اور اسکو نکلنے نہ دیتے؛ مگر ہمنے اسکو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی۔ ہما سے مراد دولتِ دنیا اور عنقا سے مراد احدیت ذات۔

وحشتے در سفر از برگِ سفر داشتہ ایم توشۂ راہ۔ دلے بود کہ بر داشتہ ایم

داغِ احسانِ قبولی لیمانش نیست ناز بر خرّمی بخت ہنر داشتہ ایم

قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرّمیِ بختِ ہنر۔ یعنی سرسبزی بخت ہنر۔ کہتا ہے کہ ہمکو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیونکہ اُسپر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے۔ یہاں خرّمیِ بخت کا لفظ استہزاءً ناسازیِ بخت پر بولا گیا ہے۔

زخمِ جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم موجِ گہرم جنبش و رفتار ندانم

یعنی جس طرح زخمِ جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آبِ گوہر کی موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے؛ ایسا ہی میرا حال ہے۔ یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے؛ نہ میرے کمال کی اطلاع ہے

نقدِ خردم۔ سکۂ سلطاں نپذیرم جنسِ ہنرم گرمیِ بازار ندانم

غالب نبود کوتہی از دوست۔ ہمانا زاں ساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھکو شعور نہیں ہوتا کہ کیونکر یہ کام بنگیا۔

ذیل کی غزل نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اسمیں پڑھی گئی تھی۔ چونکہ دلی کے تمام نامور شعرا کا۔ جو وہاں فارسی غزلیں لکھکر لیجاتے تھے۔ مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے اس لئے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کیجاتی ہے۔

ہا پری چہرہ غزالانِ رمِ مردم رمِ شاں	دلِ مردم بخمِ طرۂ خم در خمِ شاں
کافرانند تہاں جوے۔ کہ ہرگز نبود	طرۂ حور دلاویز تر از پرچمِ شاں
آشکار اکش، و بدنام نکو نامی جوے	آہ ازیں طائفہ۔ وانکس کہ بود محرمِ شاں
رشک بر تشنۂ تنہا رو وادی دارم	نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزمِ شاں
بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی۔ ہشدار	خستگانند کہ دانی و نداری غمِ شاں

یعنی اُن مصیبت زدوں کو جانے دے جنکو تو نہیں جانتا۔ مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جنکو تو جانتا ہے مگر اُن کا کچھ غم تجھکو نہیں۔

داغِ خوں گرمی ایں چارہ گرانم کوئی	آتش است آتش اگر نیبہ و گر مرہمِ شاں
ایکہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم	چہ بما منتِ بسیار نہی از کمِ شاں
ہند را خوش نفسانند سخنور۔ کہ بود	باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی۔ وانگاہ	حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار	ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شاں

مومن یعنی حکیم مومن خاں۔ جنکے دیوان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔ **نیّر** یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو۔ جنکا کلام دونو زبانوں میں بقدر معتد بہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ **صہبائی** یعنی مولانا امام بخش۔ جنکی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ **علوی** مولانا عبد اللہ خاں علوی اُستادِ مولانا صہبائی جنکی نظم و نثرِ فارسی چھپ چکی ہے، اور عربی میں بھی اُنکے قصائد موجود ہیں۔ **حسرتی**۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں رئیسِ جہانگیر آباد۔ جنکے دیوان اردو و فارسی دونو زبانوں میں چھپ چکے ہیں؛ اور اسکے سوا سفر نامۂ حج، تذکرۂ گلشن بیخار، اور رقعات فارسی بھی اُنکی تصانیف سے شائع ہو چکی ہیں۔ **آزردہ** مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں جنکا کلام اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا مگر افسوس ہے کہ اُسمیں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے۔ لیکن بعض مذہبی رسالے جو اُن سے یادگار رہگئے ہیں شائع ہو چکے ہیں۔

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن — ایں مَے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است — شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن
مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا — چاک ہا ایثارِ جیبِ پیرہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت — دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاقِ فتنہ میں جگہ پائیگا۔ یعنی فتنہ کو پسند آئیگا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اُسکو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کریگا؛ اور دونو اپنی اپنی جگہ اُسپر فخر کرینگے، اور ایک دوسرے کو جھٹلائینگے؛ اور آپس میں گتھم گتھا ہو نگے۔

ترجمہ
ہے چہ می گویم ؟ اگر اینست وضع روزگار دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن
معنی
ں سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور ووں ہوگا ؛ پھر کہتا ہے کہ ہے ہے میں
ا کہتا ہوں ؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفترِ شعر بابِ سوختن میں جلا دینے کے
لائق ہو جائیگا۔

ترجمہ
بتم کور آئینۂ دعویٰ بکف خواہد گرفت دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن
معنی
اہدِ مضموں کہ اینک شہری جان و دلست روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن
ی آیندہ یہ حال ہوگا کہ شاہدِ مضموں جوابَ جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ہے وہ کام
ہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائیگا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق
رگہری نگاہ سے غور کیجاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہجائینگے اُنکی تہ کو کوئی نہ پہنچیگا۔

ترجمہ
غ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں ہم نوائے پردہ سنجانِ چمن خواہد شدن
معنی
کلی کوّے (یعنی تک بندی کرنے والے شاعر نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پسارے ہوئے چمن کے
نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں) کی برابری کرینگے۔

ترجمہ
اد باش ایںل دریں محفل کہ ہر جا نغمہ ایست شیونِ رنجِ فراقِ جان و تن خواہد شدن
معنی
ب کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے ؛ یہ سب نغمے موزوں ہوں یا ناموزوں
یب من موت کے نوحے بنجائیں گے۔

ترجمہ
م فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید ہم بساطِ بزمِ مستی پُر شکن خواہد شدن
معنی
پندارِ وجود از رہگذر خواہد نشست بحرِ توحید عیانی موجزن خواہد شدن

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے یہ سب بیٹھ جائیگا یعنی سب فنا ہو جائینگے اور توحید عیانی کا دریا موجزن ہوگا یعنی ذاتِ واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا۔

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی؛ وہ اُسی کے پاس جاتی ہے جو اُسکے لائق ہوتا ہے۔ پس تو اے مخاطب اپنی سعی سے پشیماں ہو۔ اور وہ دولت کیا ہے؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر تو نہیں ہو سکتا لاچار مسلمانی پر قناعت کر۔ غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے جو صوفیۂ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتبِ فقر و درویشی میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر ان معنوں کے اِس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسبِ حال بھی ہو سکتے ہیں۔ جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نگذرے ہوں؛ مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتایج افکار میں شمار کئے جائیں۔ کیونکہ ملہما اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محمل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جسکو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے۔ یہ تو بہت آسان ہے؛ مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی۔ کہ اُسکی بھلائی اُنکے بغیر دشوار معلوم ہو۔ اور اُن تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرنا۔ یہاں تک کہ بدمذہب اور کافر مشہور ہونا مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہونا۔ نہایت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے ہے؛ کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایسا ایک فرد دنیا کی عجایبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے؛ ناچار مسلمانی پر اکتفا کر۔ یعنی

کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے، مگر الحمد للہ کہ خود ہماری قوم میں حسنِ اتفاق سے اسوقت
ایک شخص موجود ہے جسکی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے
زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے۔ یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جسنے کافر، ملحد، نیچری، دجال، سب کچھ
کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیرخواہی سے دست بردار نہوا۔

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن　　　جوئی! بہ خیاباں رو سیلی! بہ بیاباں شو

ہرزہ یعنی برے نام جاری ہو جانے سے قلزم نہیں ہوا جا سکتا۔ اے مخاطب تو ایک نالی ہے باغ
کی کیاریوں میں جا؛ اور ایک رَو ہے جنگل کی راہ لے۔ یہ اُن ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے
جو کسی فن میں تھوڑی سی شُدبُد حاصل کر کے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں۔

گر چرخِ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ　　　ور گوے زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہو جائے اطاعت و فرمانبرداری لزنی ضرور ہے چاہو طاعت
کو عام لو اور چاہو خاص خدا کی فرمانبرداری مراد رکھو کیونکہ جس طرح دین میں بغیر خدا و رسول کی
فرمانبرداری کے کام نہیں چلتا اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں اور باپ اور افسر و
آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

در بندِ شکیبائی مُردم ز جگر خائی　　　اے حوصلہ تنگی کن۔ اے غصہ فراواں شو

کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں مَیں کلیجہ مسوستا مسوستا مر گیا یعنی تھک گیا۔ اب سوا اسکے اور کسی طرح
اس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم حد سے بڑھ جائے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلے
تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے اب برخلاف اُسکے تنگ ہو جا؛ اور اے غم! تو زیادہ ہو جا۔

تاکہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکے، اور گُل کھیلوں، اور اِس جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں۔

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر || برخرمنِ ما برقے بر مزرعہ باراں شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں پھر جب چاہتے ہیں اُسکو تباہ کر دیتے ہیں مگر شاعر بطور مبالغہ کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینہ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گراتا رہتا ہے۔ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اِسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مسلسل اور محض عاشقانہ ہے جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی ہیں، اور اُسکو بادشاہ کی تعریف اور شکایتِ ظریفانہ پر ختم کیا ہے۔ اِس غزل میں صرف حسنِ بیان کا لطف ہے، خیالات بلند نہیں ہیں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بتے دارم از اہلِ دل رم گرفتہ || بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

دل گرفتن = اکتا جانا یعنی اِس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے بھی بگڑ جاتا ہے۔

ز سفاکی گفتن چو گل بر شگفتہ || دریں شیوہ خود را مسلّم گرفتہ

یعنی اگر کوئی اُسے سفاک کہتا ہے تو بُرا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے گویا اپنی سفاکی کو مسلّم الثبوت مانے ہوئے ہے۔

فسوں خواندہ و کارِ عیسےٰ نمودہ || پری بودہ و خاتم از جم گرفتہ

یعنی افسوں سے مسیحے کا کام لیتا ہے اور پری ہو کر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔

دمش رخنہ در زہدِ یوسف فگندہ || غمش گندم از دستِ آدم گرفتہ

دم سے مراد بات ہے دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اُسکے غم میں آدم کو گندم جیسی عزیز چیز فراموش ہو جاتی ہے۔

گہے طعنہ بر لحن مُطرب سرودہ   گہے خُردہ بر نطقِ ہمدم گرفتہ

بہ بیداد صد کشتہ برہم نہادہ   بہ بازیچہ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔

بر و یش ز گرمی نگہ تاب خوردہ   بکویش بہ رفتن صبا دم گرفتہ

نیارد ز من ہیچ گہ یاد ہرگز   مگر خوے خاقانِ اعظم گرفتہ

ظفر گر ز دم اوست در نکتہ سنجی   کہ غالب بہ آوازہ عالم گرفتہ

یہاں دم کے معنی افسون اور کرامت کے ہیں تقدیر عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی بہ آوازہ عالم گرفتہ۔

چوں زبانہا لال و جانہا پُر ز غوغا کردۂ   بادِت از خویش پرسید انچہ با ما کردۂ

یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کہتا ہے جبکہ تونے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں اور باوجود اسکے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے۔ اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تونے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گر نہ مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش   (جاں فدایت) دیدہ از بہرِ چہ بینا کردۂ

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمرست   انتقام ست ایں کہ با مجرم مدارا کردۂ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جسکی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپے ہوئی ہیں۔ پس اگر

تونے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اُسکو بخش دیا تو یہ عین انتقام ہے؛ وہ اُسکی شرمندگی سے۔ کہ باوجود اس قدر گناہوں کے ہمکو کچھ سزا نہیں دی۔ گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا۔

صد کشادو آنزا کہ ہم امروز رنج بنمودۂ مژدہ باد آں راکہ محو ذوق فرداکردۂ

خستگاں را دل پر شہای پنہاں بردہ بادرستاں گرنوازشہاے پیداکردۂ

خستگاں۔ زخمی اور شکستہ دل لوگ یعنی جنکی حالت بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اُنپر خدا کا غصہ ہے۔ درست۔ صحیح و سالم کہتے ہیں؛ درستاں اُسکی جمع ہے یعنی وہ لوگ جنکی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے۔ گویا اُنپر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تونے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے۔

چشمہ نوش ست از زہر عتاب کام جاں تلخی مے در مذاق ما گوارا کردۂ

خدا تعالے کے غصے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے؛ اور اُسکو شراب سے تشبیہ دی ہے۔ کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے، مگر شرابیوں کے مذاق میں اُس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں۔ اسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو مگر تیرے عشاق اُسکو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہرست خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

کہتا ہے کہ تونے مخلوقات کو پیدا کر کے اُسمیں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے؛ تو گویا جلوۂ حسن اور نظارۂ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج بلجاندار بود بیش ازاں کیں در رسد آنرا مہیا کردۂ

کہتا ہے [illegible]

نباتات میں تھا یعنی تو نے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سبزہ و گیاہ کو مہیا کر دیا۔ جیسا کہ
علم حیوانیات میں بیان ہوا ہے اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

دیدہ می گرید، زباں می نالد، و دل می تپد   عقدہ ہا از کارِ غالب سر بسر وا کردۂ

مقطع میں غالب نے اپنی عادت کے موافق شوخی کی ہے۔ تمام نا ملائم حالتوں کو جو قائل پر گذر رہی ہیں
ان کو از راہِ شوخی اور طنز کے عمدہ پیرایہ میں ڈھالا ہے۔ کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے، زباں فریاد کرتی
ہے، اور دل تڑپتا ہے؛ گویا تمام عقدے تو نے حل کر دئے ہیں۔ چونکہ آنکھ کا رونا، زبان کا فریاد
کرنا، اور دل کا تڑپنا، ان تینوں حالتوں میں ایک کشایش کی صورت محسوس ہوتی ہے اس لئے
ان تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو شوخی پر محمول
نہ کیا جائے تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ روئے، زبان فریاد کرے، اور
دل تڑپے؛ پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے وہ
تو نے سب حل کر دئے۔

تابم شعلۂ زرد کافر ادائے   بالا بلندے کوتہ قبائے
چوں مرگِ ناگہ لب پیارے تلخے   چوں جانِ شیریں اندک وفائے
در کامِ جوئی مسلک امیرے   در دلستانی مبرم گدائے
گستاخ [illegible] پسندے   طاقت گدازے صبر آزمائے
از خوے [illegible]   در روے دلکش [illegible] نمائے

نرد دشت کیشے آتش پرستے — برسم گزارے زمزم سرائے

برسم ۔ جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں، اور عبادت، یا نہانے، یا کھانے کے وقت اُن کو ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔ برسم گزار اور زمزم سرائے آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست برسم ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں۔

در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے — در مہربانی بستاں سرائے

تفسیدہ دشت تپتا ہوا صحرا۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

از زلفِ پرخم مشکیں نقابے — از تابش تن زریں ردائے

یعنی زلفِ پرخم اُسکے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب مُنھ پر پڑی ہوئی ہو، اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے وہ بدن کی چمک دمک سے سُنہری معلوم ہوتا ہے۔

در عرض دعوے لیلےٰ نکوہے — بر رغم غالب مجنوں ستائے

یعنی جب دعویٰ حسن جمال کرتا ہے تو لیلیٰ کی ہجو کرتا ہے؛ اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشقِ صادق تھا۔

تو کے زجور پشیماں شدی ۔ چہ می گوئی — دروغِ راست نمائے کہ داشتی داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ "میں ظلم سے پشیماں ہو گیا ہوں"، تو کب پشیماں ہوا ہے؟ کیونکہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو۔ جیسا تو پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے۔ پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیماں ہوں یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

بسینہ چون گل و در دل چو جاں خزیدی و باز — نگاہ و مہر فزائے کہ داشتی داری

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے! پھر بھی تیری نگاہ و مہر کا وہی حال ہے جو پہلے تھا! کہ محبت کی آگ بھڑکائے چلی جاتی ہے۔

عتاب و مہر تو از ہم شناختن نتواں | خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
جانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب | ترا چہ باک؟ خدائے کہ داشتی داری

بیہودہ نیست سعیِ صبا در دیارِ ما | اے بوئے گل پیامِ تمنائے کیستی
یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودۂ | اے طرفِ جوئبار چمن جائے کیستی

جائے کسے سبز بودن۔ اُسکی جگہ کا خالی رہنا۔ اور سبز ہونے کے معنی سرسبز و شاداب ہونے کے بھی ہیں۔ طرفِ جوئبار۔ کنارۂ جوبار۔ چمن کی پٹڑی پر سبزہ دیکھکر کہتا ہے کہ اے کنارۂ جوئبارِ چمن! تو جو اس قدر سرسبز و شاداب ہے تو کس کی جگہ ہے۔ چونکہ وہاں معشوق کو نہیں پایا اس لئے بطور شگون نیک کے اول یادش بخیر کہکر پھر سوال کرتا ہے۔

نشنیدہ لذتِ تو فرو میرد و بدل | اے حرف! محو لعل شکرخائے کیستی
از ہیچ نقش غیر نکوئی ندیدۂ | اے دیدہ محوِ چہرۂ زیبائے کیستی
با ہیچ کافر ایں ہمہ سختی نمیرود | اے شب بمرگِ من کہ تو فردائے کیستی

بمرگِ من۔ یعنی اے شب تجھکو میری موت کی قسم۔ چونکہ اُس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا اس لئے رات کو اپنی موت کی قسم دے کر پوچھتا ہے کہ تو کسکی فردائے قیامت ہے؟ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گذر رہی ہے کسی کافر کے ساتھ نہ گذرتی ہوگی۔ پھر تو کافر سے بھی بڑھکر کس گنہگار کی قیامت [illegible] ہے! بتا تو سہی!

[illegible] گستر نہی داد دل آزارے ندہی — تا چون دل ستان [illegible] ندہی

چشمۂ نوش بہانانہ ترا دو زدے — کش بگیری و دراندیشۂ فشارے ندہی

کہتا ہے کہ اس دل سے یقیناً چشمۂ نوش نہیں ٹپک سکتا جسکو تو بھینچکر تصور میں فشار نہ دیوے۔ یعنی جب تک کہ دل عشقِ مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرح طرح کی کوفت اسمیں نہیں اٹھاتا اسمیں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید و ہیں دائرہ بیکار زنند — تو کہ باشی؟ کہ بجز و زحمت کارے ندہی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جاوے۔

سر براہ دم شمشیر جوانی نہ نہی — تن بہ بندِ سے غم فتراکِ سوارے ندہی

خوں بذوقِ غم یزداں نشناسے نخوری — دیں بمہر حقِ الفت مگذارے ندہی

یزداں نشناس اور حقِ الفت مگذار، دونوں مرکبِ صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

آخرِ کار نہ پیداست؟ کہ در تن فسرد — کفِ خونے کہ بداں زینتِ دارے ندہی

فسرد و فسردن کا مضارع ہے۔ فسردن ٹھٹھر جانا خشک ہو جانا۔ یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے؟ کہ خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نہ کریگا مرنے کے بعد بدن میں خشک ہو کر رہ جائیگا۔

حیف گر تن بسگان سرِ کوئے نرسد — وائے گر جاں بسرِ رہگذارے ندہی

رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند — نقدِ ہوشے کہ بہ بوئے بہارے ندہی

بحم طرۂ حورانِ بہشت آویزند — نازِ پروردہ و لے ما کہ [illegible] ندہی

کر تحمل نبود ابرِ بہاری غالب — کہ در افشانی [illegible]

یعنی اگر چہ شے میں تیری مگر شان ظہور اے غالب تیری مثال ابرِ بہاری کی سی ہے کہ [illegible]
اور اُسکی گفتگو [illegible] میں تیرا یعنی بے شمار موتی برساتا ہے۔

ہالہ ز حباب آبلہ پاے طلب است   زیرِ نظر اے گوہرِ نایاب کجائی

شوریست نوا ریزی تارِ نفسم را   پیدا نہ اے جنبش مضراب کجائی

یعنی میرے تارِ نفس سے جو نغمے نکل رہے ہیں اُنھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے، مگر اے جنبشِ
مضراب کہ جس سے یہ تار بج رہا ہے تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔

بنمائے بہ گوسالہ پرستاں ید بیضا   غالب بہ سخن صاحب فرتاب کجائی

فرتاب کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناقص العیار شاعروں
کو مانتے ہیں۔

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمار [illegible]   در دل سنگ [illegible]

دیدہ ور یعنی صاحب نظر وہ شخص ہے کہ جب اُسکو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دلکش معلوم
ہیں تو وہ انکو پتھر کے اندر بتانِ آزری کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لے یعنی مادّے میں جو قابلیت
اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے وہ پہلے اِس سے کہ قوت سے فعل میں آئے اُسپر ظاہر ہو جائے۔

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو روی نیست   در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

یہ خطاب ہے جناب احدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرّے کو دیکھیے اُسکا منہ تیرے ہی رستے کی طرف
پھرا ہوا ہے اور اِس لیے تیری راہِ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ
اُسکا ہر ذرہ [illegible] رہنمائی کرتا ہے۔

ہرکو لست در برش - داغ تو دمید بس بدل   تا چو بدیگر سے دہد - بازبری بداوری

کہتا ہے کہ جسکے پہلو میں دل ہے اُسکے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اُگتا ہے! اور یہ اس لئے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگائے تو تو اِس حجت سے - کہ تیری نشانی اُسپر موجود ہے - وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری جھگڑا ٹنٹا - اور حجت -

رشک بملک چہ و چرا چوں بتو رہ نمی برد   بیہدہ در ہوائے تو می پرد از سبکسری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جبکہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے -

حیف کہ من بخوں تپم - وز تو سخن ودکہ تو   اشک بدیدہ بشمری ، نالہ بسینہ بنگری

یعنی افسوس ہے کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے - یہ سب عجیب ہیں -

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم زبے نمی   طوبیٰ اگر زمن شود ہیمہ کشم زبے بری

یعنی میری شومی بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھکو ملجائے تو اُسمیں نمی باقی نہ رہے اور مجھے اُس خاک کے سوا کچھ حاصل نہو اور اگر طوبیٰ میری مِلک ہو جائے تو وہ ایسا بے بر ہو جائے کہ اُسکی لکڑی ایندھن کے کام آئے -

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل   غالب اگر دمِ سخن رہ بضمیرِ من بری

کہتا ہے کہ اگر فکر شعر کے وقت تو میری حالتِ درونی کو ٹٹولے تو دل کے گداز سے ایک آگ کی رو بہتی ہوئی تجھکو نظر آئے - یہ اُس جوش اور اُس آگ کا بیان ہے جو اصلی شاعروں کے دل میں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے -

مرزا کی غزلیات - جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ
لیک چوتھائی سے کم نہونگے۔ انہیں سے کسی قدر اشعار - جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہوئے
بطور نمونے کے یہاں نقل کردئے گئے ہیں: تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں - مگر اتنا دماغ
نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اول سے آخر تک بنظر غور دیکھیں - وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھکر اس بات
اندازہ کرسکیں کہ مرزا کی غزل شعراے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے؟ اور
انکی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ مقتضاے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی
چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جنکی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ اپنی
تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے؛ یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اسیر وغیرہ مگر چونکہ اس مختصر
میں زیادہ گنجائش نہیں؛ اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی بھی نہیں معلوم ہوتی
اس لئے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے کہ اسوقت ان
دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں - کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل باخفتست اور بلا خفتست ہے مرزا صاحب نے بھی اسپر غزل
لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نو بیت کی ہے جسمیں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا اور مرزا کی غزل بارہ بیت
کی ہے۔ اس لئے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتیں یہاں لیجائینگی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ
ہوسکے اور بعد موازنے کے مرزا کے باقی اشعار بھی نقل کردئے جائینگے۔

نظیری	غالب
نظر بجا ہر و میاد در خفا خفتست	بوادئے کہ دراں خضر را عصا خفتست

[illegible] سینہ چہ داند بلا کجا خفتست   بسینہ می سپرد راہ گرچہ پا خفتست

نظیری نے اِس بات کو۔ کہ عشق ایسے طور پر دفعتہ پیدا ہو جاتا ہے جسکا سان گمان تک نہیں ہوتا۔ ایک معمولی حالت کے پیرائے میں۔ جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گذرتی رہتی ہے۔ بیان کیاہے۔ نظیری کا بیان۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بہت صاف اور نیچرل ہے۔ اور گو یہ مطلع اُسکے اعلےٰ درجے کے اشعار میں منسوب نہیں ہو سکتا لیکن مرزا کے مطلع سے بہرحال بہتر ہے۔

مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گذار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اِس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرتِ خضر بھی ٹھنڈے پڑجاتے ہیں میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اِس مطلع پر اُن کی زندگی میں ”عصا خفتست“ کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا۔ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے ”وے بجلہ اوّل عصائے پیر بخفت“ مگر اِس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا؛ کیونکہ شیخ کے ہاں اِس قدر قرائن موجود ہیں کہ ”عصا خفتن“ سے جو معنی اُسنے بطور استعارے کے مُراد رکھے ہیں اُن کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ بخلاف مرزا کے شعر کے۔ کہ جب تک یہ نہ جتایا جائے کہ سعدی نے عصا خفتن کے یہ معنی لئے ہیں۔ تب تک اُس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہوسکتے۔

نظیری	غالب
کجا ز عشوۂ آں چشمِ نیم باز رہیم	دگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ
کہ فتنہ خاستہ از خوابِ پای ما خفتست	مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

نظیری معشوق کی اس حالت کو جب کہ وہ سوتے سے اٹھا ہو، اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اسکے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہو۔ اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور ہمارا پانوں سوگیا ہے؛ پس اسکی چشم نیم باز کے عشوے سے الٹو کر رہائی ہوئی۔

مرزا مسافر کی اس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزل مقصود قریب ہو مگر مسافر میں نہ اسکی سواری میں آگے قدم اٹھانے کی طاقت ہو اس طرح بیان کرتے ہیں دگر زادنی ادا لخ ان دونو شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جاسکتی جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کرینگے مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے اور ہر شخص جسپر ایسی حالت گذرے اسکا مصداق ہوسکتا ہے یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

غالب	نظیری
عمت شہ شبیخون زناں پر بنگہ خلق	کسے بہ قلب بہ شبنم ترکتازے آرد
عسس بخانہ وشہ در حرم بہ خفتست	کہ برفراش قصب پاے در حنا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اول اسکو سوجھا ہے مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے کہتا ہے کہ ہیرے لہو پر آدھی رات گئے وہ شخص آکر دا کا ہوتا ہے جو ریشمی بچھونوں میں پانوں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے مطلب یہ کہ اسکا تصور اور اسکا خیال بغیر اسکے کہ اسکو اطلاع ہو رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت و

آرام بالکل برباد کردیتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شبخوں مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محلسرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں خیال نظیری کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر مرزا کی غیر معمولی اُپچ اور بلند پردازی کے ثبوت کے لیے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت ومجاز دونو پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

نظیری	غالب
شمیم مہر زباغ وفا نمے آید	ببیں زدور ومجو قرب شہ کہ منظرا
بہر چمن کہ تو نشگفتہ صباست	دریچہ باز وبدروازہ اژدہا خفتست

اگرچہ مآل دونو شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔

نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر والتفات کی خوشبو نہیں آتی، گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوق حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں کی صبا پڑی سوتی ہے (یعنی اُسکو اہتزاز مطلق نہیں ہے) جس سے اُس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار وافعال کے ذریعے سے اُسکو دُور ہی سے دیکھ لو، اور قرب شاہ یعنی ذات بحت کی تلاش مت کرو، کیونکہ اگرچہ جھروکے کے پٹ کُھلے ہوئے ہیں (یعنی اُسکے آثار وافعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیونکہ عین دروازے پر اژدھا سوتا ہے

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونوں کا یہی ہے کہ معرفتِ ذات محالات سے ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

نظیری	غالب
طبیب عشق بُبرد طمع ز بیمارے	بصبح حشر چنیں خستہ رو سیہ خیزد
کہ شب براحت ازیں دردِ بے دوا خفتست	کہ در شکایت درد و غمِ دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرضِ عشق کا طبیب اس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے جو کسی رات کو اس دردِ بے دوا یعنی عشق کی بےچینی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو۔ گویا مرضِ عشق کی علامت محمود یہی ہے کہ اسکو کبھی راحت نصیب نہو۔ مگر شعراے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے؛ حالانکہ عاشق صادق کی علامت یہی ہے کہ اسکو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہو؛ بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عین راحت معلوم ہو۔ پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشق صادق وہی ہے جو ہمیشہ بےچینی اور بیقراری میں بسر کرے؛ اور جب ایسا ہو گا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اُسکی زبان سے نکلے گی۔

مرزا نے اسی لئے اس مضمون کو اُلٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن رو سیاہ اُٹھے جو دردِ دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

نظیری	غالب
کس از معانقۂ سوزِ وصل یابد ذوق	درازیِ شبِ بیداریِ من انیمہ نیست

کہ چند شب ہم آغوشِ خود جدا خفتست　　　ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس۔ آن کس کی جگہ لایا ہے۔ معانقہ روزِ وصل۔ وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے؛ مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شب ہجر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو؛ یہ تو کچھ بڑی بات نہیں۔ ہاں یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؛ کیونکہ رات کی درازی، اور میری بیداری۔ اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں۔ سب اسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور عالی ہے۔ اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اس میں اَن نیچرل بھی نہیں ہے۔

غالب	نظیری
بدیں نیاز کہ با تست نازمی رسدم	شب امید بہ از روزِ عید مے گذرد
گدا بہ سایۂ دیوارِ بادشا خفتست	کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست

نظیری کا شعر اُسکی تمام غزل میں بیت الغزل ہے بلکہ اُسکے سارے دیوان کے اُن دو نشتروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اُسکی غزلیات میں سے انتخاب کیے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کرسکتا۔ مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر کا لنا مرزا ہی

کام تھا تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے۔ یعنی مجھ جیسے ادنےٰ درجے کے آدمی کو۔ جو تیری جناب میں نیاز ہے اُسپر مجھکو ایسا ہی ناز ہے جیسا اُس فقیر کو ہونا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سائے میں پڑا ہو۔

نظیری	غالب
فسانہ عرف نظیری مکن کہ خواب کند	بخواب چوں خوم و م آسودہ دل ای غالب
شکستہ رکہ بصد درد مبتلا خفتست	کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس لیئے سُنانا فضول ہے کہ۔ ایک شکستہ کوفتہ آدمی (نظیری)، جو طرح طرح کی تکلیف میں مُبتلا ہو کر پڑ رہا ہے۔ وہ سُو رہے گا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سُو بھی جاؤں تو اے غالب! مجھکو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا؛ کیونکہ بیمار (یعنی مَیں) جب سُویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو جاگتے یا سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

یہاں تک دونو غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیئے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار۔ جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ لکھتے ہیں۔

خروشِ حلقہ رندان ز نازنیں پسریست	کہ سر بزانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز	گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست

دلم بسبحہ و سجادہ و ردا لرزد — کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
براہ عشق من ہر کہ بنگرد داند — کہ میر قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے؛ اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا
اُسکے بعد کے تینوں شعر ہم تے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے
ہیں۔ انمیں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے۔ اور پچھلے
دونو شعر بھی نظیری کے غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے میں کم نہیں ہیں۔ نہیں اگر
نظیری کا بیت ادب کیا جائے تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونو غزلوں کو مساوی درجے
میں رکھیں۔ ورنہ انصاف یہ ہے کہ ہیأت مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے
یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لیجانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا
کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دیجائے۔ نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت
مرزا صائب کہتے ہیں۔

"صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری — عرفی بہ نظیری نرسانید سخن را"

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں۔

ہمچو شیخ نظیری حد بشر نباشد

اور شیخ ابو الفضل آئین اکبری میں اُسکی نسبت لکھتے ہیں "درے از نزہتگاہ معنی بر روی کشودہ اند"
پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں
نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اُس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہوجائیں۔ ورنہ اس غزل کی سو

اور جس قدر غزلیں مرزانے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں اُن میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جسمیں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہو۔ کیونکہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی انھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جو انکے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی میدان میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لیجانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونو غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں

شب فراق چہ دانند تا سحر چند ست　　　مگر کسیکہ بزندان عشق دربند ست

اگرچہ مرزانے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا تتبع ظاہر کرتے ہیں اس لیے اُسکی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اُسمیں۔ یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب۔ اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جسکے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگالیے گئے ہیں؛ اور اُسکے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخہ سے بھی کرلیا گیا ہے۔ اس لئے وہی غزل موازنے کے لیے انتخاب کی گئی ہے۔ اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اُسمیں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزانے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے۔ اور نیز دونو غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی

یعنی دس دس بیت کی ہیں۔

غالب	ظہوری
چو صبح من ز سیاہی تمام ماندست	بعشق قابل دیوانگی خردمندست
بگو ہم از شب چند رفت یا چندست	بُبر ز جملہ کہ آزاد مرد ایں بندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اسی کو خردمند سمجھنا چاہئے۔ تجھے چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کردے، کیونکہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بندِ عشق کا مرد یعنی اسکے لائق ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جبکہ میری صبح تاریکی کے سبب شام ہے تو مجھسے یہ کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گذری یا کتنی باقی ہے، مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن رات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی رہتی ہے، پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گذری اور کتنی باقی ہے؟ ظہوری کے شعر میں سکے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اُسنے اپنی عادت کے موافق اُسمیں بھی صنعت تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر تقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

غالب	ظہوری
نگاہِ مہر بدل سر نداده چشمۂ نوش	بشکر دیدۂ تر ۔ تر زبانئے دارم
ہنوز عیش باندازۂ شکر خندست	کہ زہر گریہ ۔ مرا دست دہ شکر خندست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدہ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں، کیونکہ گریہ کا زہر

معشوق کے شکرخند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اسکو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق گو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی جس سے ہمارا دل باغ باغ ہوجائے۔ اِس مطلب کو اِس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اُسکی نگاہِ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف اُسکے ظاہری شکرخند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور ترزبانی یا زہرگریہ اور شکرخند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں مگر مرزا کا شعر اُس سے زیادہ بلیغ نیز دل اور عاشقانہ ہے۔

غالب	ظہوری
نہ گفتہ کہ بہ تلخی لب از و پند پذیر	مگر کہ رخصتِ بے طاقتی شود مرہم
برو۔ کہ بادہ با تلخ تر ازیں پند ست	کہ گوشِ دل شدگاں ریش گشتہ پند ست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگاں (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہوگئے ہیں، اُن کے اِس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ اُنکو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہوکر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔ مرزا ناصح سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کہ ہمارے نصیب کی قسم اسلئے سے موافقت کرلے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا! اپنا رستہ لے، میں آگیا ہے۔ اور معشوق کے بادہ تلخ ہے، ہمیں ہمکو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی، عشق و محبت کا تپلا نگیا ہے

جیسا کہ ظاہر ہے۔ مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری	غالب
چہ غم کہ عہد گسل دارت کشاکش ناز	درازدستی من جالی ازفگند۔ چہ عیب؟
کہ ہر گسیختنی میدہد بہ پیوندت	زجیش۔ دلق ورع با ہزار پیوندست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش مجھسے عہد شکنی کراتی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی نہیں، کیونکہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اُسی قدر پیوند عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی اور بے باکی و رندمشربی نے دلق ورع و تقوے کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے تو میرا چنداں قصور نہیں ہے، کیونکہ اُس میں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے ہوتے ہیں یعنی خود اہل ورع و تقویٰ ہی اُسکی دھجیاں اُڑا چکے ہیں، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اُسکا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے۔ جو عشاق پر ہمیشہ گذرتا ہے۔ اور صنعتِ تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا، کہ گسیختن پر اُسکے ضدِ حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودیکہ ظہوری کے ہاں ... گی سے بندھا تھا۔ مرزا نے بھی اِس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم داد ... نہیں دی

بہ شکر دیدۂ تر۔ تر ظہوری کے شعر کو شکل سے اُسپر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

کہ زہر گریہ۔ مرادت دہ شکر

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر

غالب

بگو حدیثِ وفا از تو باور ست بگو | ز بیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
شوم فدائے دروغی کہ راست پندارست | نہ گوید ارچہ بمرگِ من آرزومندست

مرزا نے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا۔ اور ظہوری کے ہاں آرزومند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا۔ اس لئے یہ دونو مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھدی گئی ہیں معنی دونو کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر۔ یہ سُنکر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے خوشی سے مرجانا۔ واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ظہوری | غالب

زاہلِ مہر و محبت نشاں نمی پرسم کس | وجودِ او ہمہ حسنست و ہستیم ہمہ عشق
بمہرِ خویش و بہ بیمہری تو سوگندست | بہ بختِ دشمن و اقبالِ دوست سوگندست

ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اوّل دعوے کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں؛ اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بے مہری کی قسم کھاتا ہے جسکی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔ مرزا کا دعوے یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے؛ اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے۔ اور اس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے جسمیں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ رقیب کے نصیب کی قسم اسلئے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اُسی کے حصّے میں آگیا ہے۔ اور معشوق کے اقبال کی قسم اس لئے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اُسکے سوا اس عشق و محبت کا پتلا بنگیا ہے

اسکے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست، اور بخت و اقبال۔
یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا۔ اسنے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری

ز رہروان تو منزل شمار اگہ شمرد
غم از کسے کہ نمید اند اندہش چندست

غالب

شمار کجروی دوست در نظر دارم
دریں نورد ندانم کہ آسماں چندست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے، اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے۔ اُسکو تیرے رہرووں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ وہ غم از کسی ست، یعنی غم معشوق اُس شخص کا حصہ ہے جسکو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کس قدر شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے مگر مضمون کے لحاظ سے دونو شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری

نشود گسستہ بایام گرچہ زنجیر ست
اسیر آنکہ بتار نگاہ در بند ست

غالب

برنج از پے راحت نگاہ داشتہ اند
ز حکمت است کہ پائے شکستہ در بند ست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے؛ پس درحقیقت قیدی وہی ہے جو تار نگاہ معشوق میں اُلجھا ہوا ہے۔ جسکو اس قید سے کبھی رہائی نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اس لئے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو۔ اور اسکی مثال یہ ہے

کرپا شکستہ آدمی کو جو چلنے پھرنے نہیں دیتے، اور جب تک ہڈی جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں اس سے
مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اُسکو راحت حاصل ہو. ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے مگر
شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے مرزا کے ہاں مضموں میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے مگر بیاں
نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے.

غالب	ظہوری
اگر نہ بہرِ من - از بہرِ خود عزیزم دار	ز بندگاں فسرد آرزو - خدا نکند
کہ بندہ - خوبیِ اُو خوبیِ خداوند ست	ہمیں بس ست کہ ما بندہ او خداوند ست

ظہوری کے شعر میں "خدا نکند" یا تو محض حشو ہے، اور یا اُسکے بعد کچھ عبارت مقدر ہے یعنی "خدا
نکند کہ ما آرزو بکنیم" باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں.
مرزا کا شعر اُن کی غزل میں بیت الغزل ہے، اور معنی اور لفظاً دونو طرح سے ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے.

غالب	ظہوری
نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب	اسیرِ عشق - ظہوری نشانہ دارد
بریں کہ پرسد و گویند ہست خرسند ست	نشانہ اینکہ بہ بیدادِ دوست خرسند ست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیرِ عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش ہتا ہے
مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہلِ دنیا سے وفا کا طالب
ہوں؛ بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور لوگ اُسکے جواب میں
کہیں کہ ہاں ہے. دونو مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اِسکے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں.

ہمنے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کردی ہے ۔ مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے ۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہونگے ۔ اس بات کا اندازہ کرلینگے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے ۔

16/9/35

رباعیات

مرزا کی رباعیاں تعداد میں قریب سو ڈیڑھ سو کے ہیں ۔ جنمیں سے اکثر شوخی و بیباکی ، بادہ خواری ، فخر و مباہات ، اور شکایت و زارنالی کے مضامین پر مشتمل ہیں ۔ اور کسی قدر متصوفانہ ، اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں ۔ خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے ۔ مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ اُن میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کیجاتی ہیں ۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اسکی شرح بھی کردیجائیگی ۔

۱ غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم ۔۔۔ زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی ۔ زدم چنگ بشعر ۔۔۔ شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

گہر ۔ گوہر ۔ اصل ۔ دودہ ۔ نسل و خاندان ۔ زادشم ۔ پشنگ کے باپ اور تور ابن فریدوں کے بیٹے کا نام ہے ۔ جسکی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں ۔ دم تیغ ۔ تلوار کی دھار ۔ دمم یعنی میرا کلام ۔ سپہبدی ۔ سلطنت و سپہ سالاری ۔ نیا ۔ دادا ۔ نیاگاں جمع ۔ کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہماری قوم سے رخصت ہوگئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کرلیا ۔ گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بنگیا ۔

۲ فرطست کہ بہر ضبط آداب و رسوم ۔۔۔ خیزد بعد از نبی امام معصوم

ناجاع چہ گوئی بہ علی باز گر اے | مہ جائے نشین مہر باشد۔ نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر؛ کیونکہ خلفاے ثلثہ پر نجم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کرسکتے۔

۳ راہیست زعبد تا حضورِ اللہ | خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبے کہ نشانہا دارد | سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے؛ خواہ اسکو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو۔ اور یہ جو کوثر و طوبے ہیں۔ جنمیں اسکی راہ کے کچھ کچھ نشاں پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہیں جیسے اثناے راہ میں چشمہ اور۔ سایہ آجاتا ہے۔

۴ آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود | از غصۂ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانۂ و زن نیست درو | نازم بخدا چرا توانا نبود

تیسرے مصرع میں دارد کا فاعل خدا ہے جسکا نام چوتھے مصرع میں لیا ہے خانہ سے مراد خانۂ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

۵ با دستِ غم۔ آں باد کہ حاصل ببرد | آب رخِ ہوشمند و عاقل ببرد
بگذاشتہ ام مے ز صہبا بہ پسر | کش اندوہ مرگِ پدر از دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا لیجائے؛ اور دانا اور ناداں کی آبرو کو بہالے جائے؛ اسی لئے میں بیٹے کے لئے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں؛ تاکہ باپ کے مرنے کا غم اسکے دل سے دھو دے۔

۶ اے آنکہ براہِ کعبہ روئے داری نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تند مے خرامی۔ دانم درخانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

کعبہ جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بدمزاج عورت ہے جسکے سبب سے کعبہ جانے میں اسقدر جلدی ہے۔

۷ شاہا ہرچند وایہ جو آمدہ ام دانی کہ چہ مایہ نغز گو آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بہ رو آمدہ ام آبم کہ محیط را بجو آمدہ ام

۸ زانجا کہ دلم بوہم دربند بنود باہیچ علاقہ سخت پیوند بنود
مقصود من از کعبہ و آہنگ سفر جز ترکِ دیارِ زن و فرزند بنود

یعنی چونکہ میں وہم ہیں۔ جو نیست کو ہست کی صورت میں دکھاتا ہے۔ گرفتار نہ تھا، اسی لئے کعبہ کے عزم سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

۹ اے جام شرابِ شادکامی زدہ درجور دم از بلند نامی زدہ
یاد آر زمن چو بینی اندر راہے تنہا رو خستہ حرامی زدہ

حرامی = قزاق حرامی زدہ قزاقوں کا لوٹا ہوا، اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ہے اور اپنی حالت کو اُس مسافر کے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو، اور قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا ہو، گویا معشوق کو قزاق ٹھیرایا ہے۔

۱۰ اے آنکہ ترا سعی بدرمانِ من ست منعم مکن از بادہ کہ نقصانِ من ست
حیف ست کہ بعدِ من بمیراث رود ایں یک دو سہ خم کہ در شبستانِ من ست

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر مر گیا تو غضب ہو جائیگا، کہ یہ رکھتے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئینگے، میرے وارثوں کو پہنچ جائینگے۔

١١ آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیِ دہر ریزد ہمہ دُرد و دُرد و تلخ آبہ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست۔ کہ مرا ناہید بہ غمزہ کُشت، و مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں قسم کے ستارے نحس ہو گئے، کہ زہرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے۔

١٢ شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر خونابہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

١٣ غالب روشِ مردمِ آزاد جداست زقتارِ اسیران رہ و زاد جداست
ما ترکِ مراد را ارم می دانیم واں باغچۂ ضبطی شداد جداست

یعنی آزاد لوگوں کی اَور روش ہے، اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں انکا اور ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں، ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام ارم ہے؛ اور وہ ارم جس سے شداد محروم رکھا گیا وہ ہمارے ارم سے الگ ہے۔

١٤ ایں نامہ کہ راحتِ دلِ ریش آورد سرمایۂ آبروے درویش آورد
در ہر سخن مژدہ سید جانے۔ یعنی سامانِ نثارِ خویش باخویش آورد

١٥ منصور کشش زنکتہ چیناں پی بود در راست خطر زہمنشیناں چہ بود

چوں عاقبتِ یگانہ بیناں دارست　　　دریاب کہ انجام دو بیناں چہ بود

کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا تو منصور کو اسکی کچھ پروا نہیں مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بیں لوگوں کا انجام دار ہے تو دو بینوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

۱۶ ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است　　　بر خاکِ رہِ عجز سرے داشتہ است

زاہد ز خدا ارم بدعوے طلبد　　　شدّاد ہمانا پسرے داشتہ است

کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے اسکو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعوے کے ساتھ طلب کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شدّاد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا۔ کیونکہ اوّل تو ارم جو کہ متروکہ شدّاد ہے اسکا دعوے کرنا، اور پھر خدا کے سامنے اسکے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونو باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شدّاد نے اپنا وارث حقیقی چھوڑا تھا۔

۱۷ غالب بسخن گرچہ کسے ہمسر نیست　　　از نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست

مے خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار!!!　　　ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

کہتا ہے کہ اے غالب اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، مگر عقل کا نشہ تیرے دماغ میں بالکل نہیں، شراب چاہتا ہے، وہ بھی مفت، اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کثرت سے!!! یہ بادہ فروش ہے، ساقی کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کر دیگا۔

۱۸ گر دیدنِ زاہداں بجنت گستاخ　　　ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ

چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ　　ماند بہ بہائم و گلگشت زارِ فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بیباک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لئے ہاتھ مارنا، اگر غور کرکے دیکھو تو اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اسمیں ڈھور ڈانگر چرتے پھرتے ہیں۔

۱۹　آں را کہ بود درستئِ در فرجام　　ہم محرمِ خاص آید و ہم مرجعِ عام
آسیاں نبود کشاکش پاسِ قبول　　زنہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام

فرجام - انجام او نکوئی انجام اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جسکی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاس قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے۔ نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور۔ ہونا نہیں چاہیے۔ اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے جس سے ساری رباعی میں جان پڑگئی ہے۔

۲۰　در عالمِ بے زری کہ تلخست حیات　　طاعت نتواں کرد بامیدِ نجات
اے کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰۃ　　بودے بوجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ

کہتا ہے کہ بے مقدوری کی حالت میں جبکہ زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی اُمید پر طاعت نہیں ہوسکتی کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تمول شرط ہے روزہ اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

۲۱ هرچند زمانه مجمعِ جہالست — در جہل ز حال شان بیک منوالست
کودن همه - لیک از یکے تا دگرے — فرقِ خرِ عیسی و خرِ دجالست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جھتراں جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں انکا حال تفاوت مختلف ہے۔ کودن تو سب ہیں۔ مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خرِ عیسی اور خرِ دجال میں۔

۲۲ تا میکش و جوہر دو سخنور داریم — شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست — در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر احمد حسین میکش کے حق میں - کہ دونوں مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے - لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم - یعنی پیرِ مغانیم - باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

۲۳ دستم بہ کلیدِ مخزنے می بایست — ور بود تہی - بدامنے می بایست
یا ہیچ گہم بکس نیفتادے کار — یا خود بزمانہ چون منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہیے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو میں کسی کا دامن ہونا چاہئے تھا - جسکے توسل سے زندگی بسر ہوتی، یا مجھکو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا، اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحب کمال ہوتا - جو میری قدر کرتا۔

۲۴ ہستم زہے امید سرمست و بس ست — دارم سرِ این کلاہ در دست - و بس ست
گر ارزشِ لطف و کرمے نیست - مباش — استحقاقِ ترحمے ہست - و بس ست

سرِ این کلاہ - یعنی سرِ این رشتہ - باقی معنی ظاہر ہیں۔

زمان
میکش جوہر
مخزنے
امید عفو

۲۵ گر گرد ز گنجِ گہرے بر خیزد — مپسند کہ دود از جگرے بر خیزد

منت نتواں نہاد بر گدیہ گراں — بنشیں کہ بخدمت دگرے بر خیزد

گنجِ گہر سے گرد اُٹھنے کے معنی اُسکے خالی ہوجانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہوجائے تو بلا سے، مگر یہ گوارا نہ کرکہ کسی کے جگر سے دُھواں اُٹھے۔ بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا؛ خدانے اُنکی خدمت پر تجھکو کھڑا کیا ہے؛ اگر تجھسے یہ خدمت پوری نہیں ہوسکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا اِس خدمت کے لئے اُٹھے۔

۲۶ اے دوست بسوی این فرو ماندہ بیا — از کوچۂ غیر راہ گردانده بیا

گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام — بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

اوپر کے دونو مصرعے صاف ہیں اُسکے بعد کہتا ہے کہ اے دوست تونے مجھسے کہا تھا کہ مجھے مت بُلانا میں تیری موت ہوں اچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہ اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے تو بھی بن بُلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیرِ دامت باشد — صافِ مےِ خسروی بجامت باشد

۲۷ تسبیح بہر اسمِ الٰہی کہ بود — آغاز ز ابتدائے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علیخاں مرحوم کو جو مرزانے خط لکھا تھا اُسکے اول میں لکھی تھی معنی ظاہر ہیں

۲۸ بازیِ خورِ روزگار بودم ہمہ عمر — از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر

بے مایۂ فکرِ سود ماندم ہمہ سال — بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

۲۹ باید کہ دلت ز غصّہ برہم نشود — از رفتنِ زر دست خوش غم نشود

ایں سیم و زرست خواجہ! ایں سیم و زرست　　غم نیست کہ ہر چند خوری کم نشود

دست خوش۔ مغلوب و زیر دست۔ کہتا ہے کہ اے دولتمند! چاہئے کہ روپے کے کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا ہوا ہے۔ اے حضرت یہ سیم و زر ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم و زر کا یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائیے کم نہیں ہوتا۔

۳۰　دارم دلِ شاد و دیدہ بینائے　　وز کر ہی گوشم بود پروائے
خوب ست کہ نشنوم ز ہر خود رائے　　گلبانگ انا ربکم الاعلائے

کہتا ہے کہ مجھکو کری گوش یعنی ثقلِ سماعت کی کچھ پروا نہیں، بلکہ اسکو بہتر سمجھتا ہوں، کیونکہ مغرور اور خود پسندوں کی زبان سے انا ربکم الاعلیٰ (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

۳۱　اے کردہ بار آئشِ گفتار بسیچ　　در زلفِ سخن کشودہ راہِ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش پنداری　　ذاتے ست بسیط منبسط دیگر ہیچ

بسیچ۔ قصد۔ زلفِ سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی۔ کہتا ہے کہ عالم جسکو تونے کچھ اور چیز سمجھ رکھا ہے۔ وہ صرف ذات واحد ہے جو بسیط ہے یعنی مرکب نہیں۔ اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ بس اسکے سوا کچھ نہیں۔

۳۲　اے تیرہ زمیں کہ بودۂ بستر من　　ہر خاک کہ با تست ہمہ بر سر من
نہ بہر کسان و بہر من دانہ و دام!　　اے مادر دیگران و مادندر من

مادندر سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لئے تو تجھپر سونا اچھا ہوا ہے اور میرے لئے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں، گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری مادندر ہے۔ یہ مضمون

تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے، مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے رودکی کہتا ہے۔ "جانا چہ بینی تو از بچگاں + کہ مادر گہے گاہ مادندری"
اور فرخی کہتا ہے۔ "مہرِ فرزندی بر خواجہ فگندہ ست جہاں + ایں جہاں مادرِ او نیست کہ مادندرِ اوست"

۳۳ آنرا کہ ز دستِ بے زری پامال ست | رسوائی نیز لازمِ احوال ست
ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے | ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

کہتا ہے۔ کہ مفلس آدمی کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چنانچہ ہمکو دیکھو کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں، اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں، گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ مُنہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کبھی کلال کی دوکان پر جاکر تہ پیا کرتا ہے، اور جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے تو بدمست ہوکر اُسکی دوکان ہی پر یا بازار میں گر پڑتا ہے، اور آنے جانے والے سب اُسکو دیکھتے ہیں۔ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں تو اُس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے اور سب لوگ دیکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی اُسکو اطمینان سے سیر ہوکر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقیِ تقدیر ہمکو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تر نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شور بور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں۔

۳۴ اے داوہ بباد عمر در لہو و فسوس | زنہار مشو ز رحمتِ حق مایوس
ہشدار اگر آتشِ جہنم حق را | تندیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

افسوس۔ ہنسی ٹھٹھا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے

(جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اُسکی کھوٹ نکالنی منظور ہوتی ہے اِسی طرح آتش غم
سے نفوسِ انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

٣٥ یارب تو کجائی کہ بما زر ندہی | بیدرد خدائی کہ بما زر ندہی
نے نے۔ تو نہ غائبی، و نے بیرحمی، | بے مایہ چو مائی کہ بما زر ندہی

اِس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گذر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اُسپر کفر
کا فتوے دیا جائیگا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجاے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور
یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوشحالی و بدحالی
کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے؛ اور تدبیر و عقل و دانش کو اُس میں بالکل عاجز و درماندہ سمجھتا
ہے؛ یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ میں نے تدبیر نہیں کی،
یا تدبیر میں مجھسے غلطی ہوگئی، یا ہماری کاہلی و سستی سے یہ تنگدستی ہمکو نصیب ہوئی؛ بلکہ نہایت
تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ جو ہم کو کچھ نہیں
ملتا؛ وہاں اِس قسم کے خطابات آداب شریعت کے بالکل خلاف ہیں؛ اور ایسے ہی خطابات
کی نسبت کہا گیا ہے۔

"ما بروں را ننگریم و قال را | ما دروں را بنگریم و حال را"

قصائد مرزا کے قصائد جن میں قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ بھی
شامل ہیں۔ کیا باعتبار کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت کے اُنکے اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز و منتخب
اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت

اُستاد کی تغزل سے گرا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اکثر کی غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہو۔
مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جسمیں تغزل کی شان یعنی
عام فہم اور خاص پسند ہونا۔ بہت کم پایا جاتا ہے۔ بخلاف قصیدے کے کہ اسمیں قصیدے
کی شان جیسی کہ ہونی چاہیے اول سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمان و ظہیر کا اور کہیں عرفی
و نظیری کا: اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت
مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے: اور اسی سے قصیدے کی پستی و
بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً
کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا سیٹھا ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا؛ علی الخصوص
متاخرین نے مبالغہ کی لَے بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا ہے؛ اور اس
کلیہ سے مرزا کی مدح بھی مستثنےٰ نہیں۔ البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن
پیدا کیا ہے جو اُسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں
پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اُس سے مُعرا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں
کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لیگئی ہیں۔

چونکہ مرزا کے تمام قصائد اور اُنکے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجایش نہیں
ہے اِسلئے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں۔ اور ایک آدھ مدح اور کچھ
قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اِس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند

نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کرینگے تاکہ اصحاب ذوق صحیح کو دونو کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقہ کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

منتخب از قصیدۂ توحید الٰہی

توحید

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ ۔۔۔ گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

دیدہ بیروں و دروں از خویشتن پرداختگی ۔۔۔ پردۂ رسم پرستش در میاں انداختہ

نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ ۔۔۔ شور در عالم ز حسن بے نشاں انداختہ

چرخ را در قالب ابداع در روا ریختہ ۔۔۔ خاک را بر نطع پیدائی ستاں انداختہ

عاشقاں موقفِ دار و رسن وا داشتہ ۔۔۔ غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ

رنگہا ز طبعِ ارباب قیاس انگیختہ ۔۔۔ نکتہ ہا در خاطرِ اہل بیاں انداختہ

با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوی ۔۔۔ مُردہ را از خویش در یا برکراں انداختہ

دوئی کو مُردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے یعنی جسطرح دریا مردے کو باہر پھینکدیتا ہے اسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نردبانے بستہ با دیوار کاخے در نظر ۔۔۔ انتعاشے در نہاد این و آں انداختہ

رفتہ ہر کس تا قدمگاہے ز انجا خویش را ۔۔۔ پایہ پایہ از فراز نردباں انداختہ

غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد ۔۔۔ بہرِ آسانی اساسِ آسماں انداختہ

گل چو ماند دیر گرد در روش بازار سرد — بہر تجدید طرب طرح خزاں انداختہ

آتشے از روے گلہاے بہار افروختہ — شعلہ در جان مرغ صبح خواں انداختہ

دجلہ در ساغر معنی طرازاں ریختہ — شیحہ در کاسۂ دریا دکاں انداختہ

جز بدیں آب آتش زردشت نتواں سرد کرد — کعبہ را جوے بہشت از ناوداں انداختہ

جز بدیں الماس نتواں آہنیں در سفت — رخنہ اندر اسلام در کیش مغاں انداختہ

یعنی آتش زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی اس لیے میزاب کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کردی اور کیش مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اُسکا بیندھنا یعنی اُسمیں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

چشم را بخشیدہ چوناں گردشے کار باب ہوش — بر زمیں دانند طرح آسماں انداختہ

(یعنی چشم معشوقاں را)

دادہ ابرو را بد انسان جنبشے کا ہل تیاس — در تن شمشیر پندار ند جاں انداختہ

اے ز شرم خاکساران تو از شہپر ہما — چوں گلیم کہنہ ظل سایگاں انداختہ

ذوق تمکین گدایان تو گنج شاہ را — از دل گنجور در چشم پاسباں انداختہ

تا دریں صورت ز چشم دشمناں پنہاں بود — دوست را اندر طلسم امتحاں انداختہ

تا علاج خستگی آسایش دیگر دہد — خارہا در رہگذار میہماں انداختہ

مرثیہ و نوحہ

کفرست کفر در پے روزی شتافتن — ننگ ست ننگ در غم دنیا گریستن

گاہے بہ داغ شاہد و ساقی گداختن — گاہے بہ ہجر مالک و بابا گریستن

باید بدرد ہرزہ گرستن۔ دگر گریست — بیجا گریستیم۔ دریغا گریستن

رشک آیدم بابر کہ در حد وسع اوست — بر خاکِ کربلاے معلیٰ گریستن

رفت آں چہ رفت۔ بادم اکنوں ہدا نگاشت — از بہر نورِ دیدۂ زہرا گریستن

باراں رحمتے!!! کہ باندازِ شست و شو (یعنی لقصد شست و شوے) — دارد بروسیاہی اعدا گریستن

خود را ندیدزاں لبِ نوشیں بکامِ خویش — زیبد بہ شور بختی دریا گریستن

مزدِ شفاعت و صلۂ صبر و خوں بہا — ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن

چوں زرق عیب در دترا عام کردہ اند — سر میزند ز مومن و ترسا گریستن

اے فلک شرم! ز ستم بر خاندانِ مصطفیٰ — داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفیٰ!

اے بمہر و ماہ نازاں ہیچ میدانی چہ ہست — از تو بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفیٰ!

سایہ از سرو روانِ مصطفیٰ نفتد بخاک — ہاں چہ بر خاک افگنی سرو روانِ مصطفیٰ!

گرمیٔ بازارِ امکاں خود طفیلِ مصطفیٰ ست — ہیں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفیٰ!

کینہ خواہی ہیں!! (لتشفی) کہ با اولادِ امجادش کنی — آنچہ با ہمہ کردہ اعجازِ زبانِ مصطفیٰ!

نیک نبود کز تو بر فرزندِ دلبندش رود — آنچہ رفت از مرتضیٰ بر دشمنانِ مصطفیٰ!

یا تو دانی مصطفیٰ را فارغ از رنجِ حسینؑ؟ — یا تو خواہی ایں مصیبت امتحانِ مصطفیٰ؟

یا مگر گاہے ندیدی مصطفیٰ را با حسینؑ؟ — یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفیٰ؟

آں حسین ست ایں کہ گفتے مصطفیٰ روحی فداک — چوں گذشتے نامِ پاکش بر زبانِ مصطفیٰ

آں حسینؑ ست ایں کہ سوی مصطفیٰؐ چشمش بہ رخ　　بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفیٰؐ

(کی حیثیم درحس)

قدسیاں را نطقِ من آوردہ غالبؔ در سماع　　گشتہ ام در نوحہ خوانی مدح خوانِ مصطفیٰؐ

اے کج اندیشہ فلک حرمت دیں بایستے　　علمِ شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے

تا چہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند　　عزتِ شاہِ شہیداں بہ ازیں بایستے

حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن بر خاک　　آنکہ جولانگہ او عرش بریں بایستے

حیف باشد کہ ز اعدا دمِ آبے طلبد　　آنکہ سائل بدرش روحِ امیں بایستے

(درحقیقت آنے)

تازیاں را بہ جگر گوشۂ احمد چہ نزاع　　وطنِ اصلی ایں قوم زمیں بایستے

ایہا القوم! تنزل بود از خود گویم　　میہماں بے خطر از خنجر کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنیٰ درجے کی بات ہے اگر یہ کہا جاے کہ اے اہلِ شام کربلا کا مہمان خنجر کیں سے محفوظ رہنا چاہیئے تھا بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے یعنی جیسا اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن اینست کہ در راہِ حسینؑ ابنِ علیؑ　　بوسہ از روی عقیدت بہ جبیں بایستے

چشمِ بد دور بہ ہنگامِ تماشای رخش　　رونما سلطنتِ روی زمیں بایستے

داشت ناخواستہ در شکر قدومش دادن　　اگرش ملک وگر تاج و نگیں بایستے

(دادن داشت بمعنی بایست داد ۱۲)

چوں بفرمانِ خود آرائی و خود بینی و بغض　　آں نکردید کہ از صدق و یقیں بایستے

با اسیرانِ ستم دیدہ پس از قتلِ حسینؑ　　دلِ نرم و منشِ مہر گزیں بایستے

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالبؔ — علمِ شاہ نگوں شد۔ نہ چنیں بایستے

نوحہ

وقتست کہ در پیچ و خمِ نوحہ سرائی — سوزد نفسِ نوحہ گراز تلخ نوائی

وقتست کہ آں پردگیاں گزرہ تعظیم — بر در رگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی

از خیمہ آتش زدہ عریاں بدر آیند — چوں شعلہ دخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی

جانہا ہمہ فرسودہ تشویشِ اسیری — دلہا ہمہ خوں گشتہ اندوہِ رہائی

اے چرخ چو آں شدہ گراز بہر چہ گردی — اے خاک چو ایں شدہ گر آسودہ چرائی

خوں گرد و دخترہ ریز! اگر صاحب مہری — برخیز و بخوں غلط! اگر از اہلِ وفائی

تنہا ست حسینؑ ابن علیؑ بصف اعدا — اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی

توقیع شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت — از خونِ حسینؑ ابنِ علیؑ یافت روائی

فریاد ازاں حاملِ منشورِ امامت — فریاد ازاں نسخہ اسرارِ خدائی

فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی — فریاد ازاں خواری و بے برگ و نوائی

فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی — فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی

غالبؔ جگری خوں کن و از دیدہ فرو بار — گر روئے شناسِ غمِ شاہِ شہدائی

نوحہ

سروِ چمنِ سروری افتاد زپا۔ ہائے — شد غرقہ بخوں پیکرِ شاہِ شہدا۔ ہائے

برخاکِ رہ افتادہ تنے ہست۔ سرش کو — آں روئی فروزندہ و آں زلفِ دوتا۔ ہائے

عباس دلاور کہ دران راہروی داشت — شمشیر بیکدست و بیکدست لوا - ہاے

آن قاسم گلگون کفنِ عرصۂ محشر — وان اکبرِ خونین تنِ میدانِ وغا - ہاے

آن اصغرِ دل خستۂ پیکانِ جگر دوز — وان عابدِ غمدیدۂ بے برگ و نوا - ہاے

اے قوتِ بازوے جگر گوشۂ زہرا — دستِ تو بشمشیر شد از شانہ جدا - ہاے

اے شہرہ بدامادی و شادی کہ نداری — کافور و کفن - بگذرم از عطر و قبا - ہاے

اے مظہرِ انوار کہ بود اہل نظر را — دیدارِ تو دیدارِ شہِ ہر دو سرا - ہاے

اے گلبنِ نورستۂ گلزار سیادت — نایافتہ در باغِ جہان نشو و نما - ہاے

اے منبعِ آن ہشت کہ آرایشِ خلدند — داغم کہ رسن شد بگلوے تو روا - ہاے

بالغ نظرانِ روشِ دینِ نبی - حیف — قدسی گہرانِ حرمِ شیرِ خدا - ہاے

ماتم کدہ آن خیمۂ غارت زدگان حیف — غارت زدہ آن قافلۂ آلِ عبا - ہاے

آن تابشِ خورشید دران گرم روی حیف — وان طعنۂ کفار بدان شورِ غزا - ہاے

غالب بملائک نتوان گشت ہم آواز — اندازۂ آن کو کہ شوم نوحہ سرا - ہاے

بیا در کربلا تا آن ستمکش کاروان بینی — کہ در روے آدمِ آلِ نبارا ساربان بینی

نہ بینی ہیچ بر سر خازنانِ گنجِ عصمت را — مگر در خاربن ہا تار و پودِ طیلسان بینی

ہمانا سیلِ آتش بردہ بنگاہِ غریبان را — کہ ہر جا پارۂ از رخت و موے از رخان بینی

بہ بینی چشمہ ہا از آب چون جوئے کنارش را — ز خونِ تشنہ کامان چشمۂ دیگر روان بینی

به بینی سرخوش خواب عدم عباس غازی را / به شکلش در خم بازو نه تیرش در کمان بینی

هجوم خستگان و سوز و ساز نوگرفتاران / نوآیین بزم طوبی قاسم ناشادمان بینی

نمی بینی که چون جان داد زین بیداد بدخواهان / علی اکبر که همچون بخت بدخواهش جوان بینی

گر از تیر کمانی سینه بینی در روا بی دو چشمه هم / بخون آغشته نازک پیکر اصغر چسان بینی

چه دندان و جگر افشرده باشی گاه زدن دمی / حسین ابن علی را در شمار کشتگان بینی

نیاری گرد ران گردش که پایش در رکاب آری / زمینی گر خود آن شه را که در تشنه عنان بینی

تنی را کش رگ گل خار بودی بر زمین یابی / سری را کش ز افسر عار بودی بر سنان بینی

ستایش روزگار

هست از تمیز گر به هما استخوان دهد / آیین دهر نیست که کس را زیان دهد

مردست مرد هر چه کند بی خطر کند / رادست راد هر چه دهد رایگان دهد

گلزار را اگر نه ثمر گل بسنده / درویش را اگر نه سحر شام نان دهد

گنج سخن نهد به نهان خانهٔ ضمیر / وانگه کلید گنج بدست زبان دهد

تا روز خاک تیره نه گردد ز رشک چرخ / رخشانی ستاره بریگ روان دهد

تا آدمی ملال نگیرد ز یک هوا / سرمای نوبهار و تموز و خزان دهد

هم در بهار گل شگفاند چمن چمن / تا راحت مشام و نشاط روان دهد

هم در تموز میوه فشاند طبق طبق / تا آرزوی کام و مراد دهان دهد

آن را که بخت دسترس بذل مال نیست / طبع سخن رس و خرد خرده دان دهد

آں ماکہ طالع کفِ گنجینہ پاش نیست — قسم البدل ز خامۂ پرویں فشاں دہد

دانم کہ آسماں بزمیں پیشکار نیست — عکسِ چہ جلوہ روشنیِ روشناں دہد

چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور ست — بیداد نبود انچہ بما آسماں دہد

رنگ از گل است و سایہ ز نخل و نوا ز مرغ — ہرجا بہار ہرچہ بود درخورِ آں دہد

در نشترِ نغمہ قرعہ بنامِ ہوا زند — در نشوِ سبزہ حکم بہ آبِ رواں دہد

مستیز با نسیم اگر بلبلے بباغ — جاں در نور و خار و خسِ آشیاں دہد

دارو ز بہرِ زندگی آمد نہ بہرِ مرگ — مرہم ز نشترِ عیسیٰ است اگر خستہ جاں دہد

پرویز را دیر یاب شہے بود ورنہ بخت — آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد

فرہاد زود میر کسے بود ورنہ دہر — کامِ دلِ غریب پس از امتحاں دہد

[illegible] ز روزگار نویدے کہ آں نوید — در پیریم بشارتِ بختِ جواں دہد

[illegible] باز غنچہ درست — شادم کہ مژدہ بندگیم ناگہاں دہد

[illegible] سر آید شمار غم — راہم ببارگاہِ شہِ انس و جاں دہد

[illegible]ی کہ رائے او — منشورِ روشنی بہ شہِ خاوراں دہد

صفتِ سالکانِ طریقت

[illegible] ل کہ آبلہ پا بنند — پائے را [illegible] اور حبیب [illegible]

[illegible] مدینہ عیانست [illegible] دارند — [illegible] معائرِ اسلام کا بیان ہے کہتا ہے کہ وہ

[illegible] و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلیٰ وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

یہ شعر گویا ماحصل ہے اس قول کا کہ "لَیْسَ فِی الاِمْکَانِ اَبْدَعُ مِمَّا کَانَ"، یعنی جو نظام عالم کا اب موجود ہے اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دور بینانِ ازل۔ کوری چشم بد بیں — ہم دریں جا نگرند آنچہ در آنجا بینند

رانہ زیں دیدہ دراں جو کہ از دیدہ وری — نقطہ گرد در نظر آرند سویدا بینند

(یعنی چشم بد بیں)

راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی — جادہ چوں نبضِ تپاں رگِ صحرا بینند

شررے راکہ بناگاہ بدر خواہد جست — زخمہ گرد ارتبارِ رگ خارا بینند

قطرہ راکہ ہر آئینہ گہر خواہد بست — صورت آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

(یعنی گہر خواہد شد)

شام در کوکبۂ صبح۔ نمایاں نگرند — روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند

وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصوّر سنجند — مجمعِ اُنس بہ نئے بست زلیخا بینند

کاخِ مصوّر وہ محل جسکو زلیخا نے وصال یوسف کے لئے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ عیش و کامرانی جمع تھا۔ نے بست وہ جھونپڑا جو یوسف کے قید ہو جانے پر انکی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لئے بنا لیا تھا اور اسمیں رہتی تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کاخ مصور جیسے آراستہ محل میں اُس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخرکار پیدا ہوا اور اُنس اور ملاپ کو اُس نئے بست میں دیکھ لیتے ہیں ہم در بہار لن اکستعاکمر بیہ نصیب ہونے والا تھا۔

ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق — مرحا آرزو سازد وامق دُعد ز ما بینند

آں راکہ بخت دسترسِ نیلِ ما نیست — طبع سخن رس و خرد خردہ داں [illegible]

سن لیتے ہیں اور وامق وعذرا کی روئداد جو عرب اسے بیان کرتے ہیں یہ لوگ اسکو خود وامق
و عذرا پر گذرتی دیکھ لیتے ہیں۔

نستوہند اگر ہمرہ مجنوں گردند	نخروشند اگر محمل لیلےٰ بینند
خوں خورند وجگر از غصہ بدنداں گیرند	خویش را چوں بسر مائدہ تنہا بینند

یعنی جب انکے ساتھ کوئی دوسرا دسترخوان پر نہیں ہوتا تو دانت پیستے ہیں یعنی جو فیض ان کو
پہنچتا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سر و تن را گر از در دستوہ انگارند	جان و دل را گر دوست شکیبا بینند
قطرۂ آب بہ لب بوسۂ نشتر شمرند	پارہ ناں بہ گلو ریزۂ مینا بینند

یہ دونو شعر دست و گریباں ہیں مطلب یہ ہے کہ در مطلب سے اکتا جانا اور دوست کے خیال
سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند	بادہ را شمع طربخانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور کسی چیز سے
ازراہ تعصب ناک نہیں چڑھاتے۔

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب	خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلےٰ بینند

برسم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنار ہندوؤں کے ساتھ اور صلیب عیسائیوں
کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے مصرع میں شعائر اسلام کا بیان ہے کہتا ہے کہ وہ
لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلےٰ وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

دل نہ بندند بہ نیرنگے دریں دیر دو رنگ　　ہر چہ بینند بعنوانِ تماشا بینند

جام جویند و زرندی نگرایند بزہد　　سبحۂ انجم اگر دید بصفا بینند

ہر چہ در شیوہ(بہت) تواں یافت بہر سو یابند　　ہر چہ در جا(نہاں) نتواں دید بہر جا بینند

ہمہ گردند دراں پایہ کہ او را دانند　　ہیچ باشند دراں وقت کہ خود را بینند

ایں نظرہائے گرانمایہ فراموش کنند　　چوں بہ نیرنگِ سخن شعبدۂ ما بینند
(یعنی ایں ملاحظات کہ املا مذکور شدند)

نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند　　نثر را نسخۂ اعجازِ مسیحا بینند

گہ پئے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند　　گہ پئے فال بصد رنگ تمنا بینند

بمرد از یاد کہ دنیاست نمودِ بے بود　　ایں دل افروز نمودیکہ ز دنیا بینند

اِس مقام پر اِس شعر کی خوبی وجدانی ہے بیان میں نہیں آسکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گذرے گی تو وہ اُنکے دل سے اِس عارفانہ خیال کو فراموش کردیگی کہ دنیا محض ایک نمودِ بے بود ہے۔

صفتِ موسم بہار

شکر کہ آشوبِ برف و باد سر آمد　　نامیہ از بندِ زمہریر بر آمد

کسب ہوا نفعِ آبِ خضر(آبِ حیواں) رساند　　سبزہ جہان را بہ بیشہ راہبر آمد

یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو آبِ حیات کے پینے سے ہوتا ہے اور جس طرح خضر آبِ حیات کا رستہ بتاتا ہے اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

در چمنستاں کشودہ بارِ نوادر(نفائس)　　باد کہ بازارگانِ بحر و بر آمد

اشتیلم انتظارِ گل بود۔ ایرنہ — دیدۂ نرگس زحد و چوب بدر آمد

تا زچہ دانستہ قُربِ مقدمِ گل را — سبزہ بہ باغ از شگوفہ پیشتر آمد

یعنی سبزہ جو شگوفے سے پہلے باغ میں آلیا ہے اسنے گل کی آمد آمد کہاں سے سُن لی۔

بیہدہ بنود خروشِ مُرغِ سحرخواں — کو کبۂ گل مگر بباغ در آمد

قیس کجا تا کند شمارۂ محمل — از پسِ ہر غنچہ غنچۂ دگر آمد

غنچے کو محمل سے اور گل کو لیلی سے تشبیہ دی ہے کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے سوا دوسرا محمل نہیں جانتا وہ آئے اور محملوں کو شمار کرے کیونکہ ہر غنچہ کے بعد دوسرا غنچہ اور دوسرے کے بعد تیسرا وَ ہَلُمَّ جَرًّا نکلتے چلے آتے ہیں۔

کثرتِ انواعِ گل نگر کہ ہیولے — رنجہ ز بارِ فزونیِ صُوَر آمد

یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اِس قدر کثرت ہے کہ ہیولے بیشمار مختلف صورتوں کی بہتات سے عاجز آگیا ہے اور تھک گیا ہے۔

لالہ بسیجد زتیغ کوہ گذشتن — دامنش اینک ز زیر سنگ برآمد

بسیجد یعنی ارادہ کرتا ہے تیغِ کوہ قُلّۂ کوہ۔ دامن از زیرِ سنگ برآمدن مصیبت سے نجات پانا۔

نکہتِ گل شد وبائے عامِ جُعَل را — زنجرہ ہر شب نہ ہرزہ مویہ گر آمد

جُعَل ایک جانور ہے سیاہ رنگ۔ جسکو خوشبو راس نہیں اِسی لئے موسمِ بہار میں مرجاتا ہے اور چونکہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے اِس لئے اُسکو ہندی میں گُبریلا کہتے ہیں۔ زنجرہ جھینگر جو بات کو اکثر بولتا ہے۔ مویہ گر نالاں و گریاں۔

میکدۂ خسروِ گل ست- رزستاں　　　صورتِ مینا ز غورہ در نظر آمد

کہتا ہے کہ رزستاں یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسروِ گل کا شراب خانہ ہے کیونکہ اسمیں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں.

زو غم تر دامنی مخمور- کہ جہاں را　　　موج گل از ہر کرانہ ناگہ آمد
فتوی مے داد ابر و باد و لیکن　　　شیشہ نہاں بر کنارہ بگہر آمد

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا-

در روزگار ما نتواند شمار یافت　　　خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکارِ تیز گردِ فلک در میاں ببیں　　　حق داد داد حق کہ بمرکز قرار یافت
درہائے آسماں بزمیں باز کردہ اند　　　ہر کس ہر آنچہ جست بہ روزگار یافت
آمد اگر بعرض ز بالا بلا فرود　　　بر روی خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
چوں حسنِ ماہ یک شبہ بینی- بداں کہ ماہ　　　پاداشِ جانگدازیِ شبہای تار یافت
چوں رنگِ دی گل نگری- شاد شو کہ گل　　　اجرِ جگر خراشیِ پیکانِ خار یافت
در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود　　　ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز بداد گرایش نمی کند　　　دہر ہر چہ صورت ازیں چہار یافت
ہر کس بقدرِ فطرتِ خویش ارجمند گشت　　　ہر شے بحسنِ جوہرِ خویش اشتہار یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی نبشت　　　ہم بر درِ سرای خودش بندہ وار یافت

دربندہ خود ز خشم خطا بندگی درید | توقیع خوشدلی ز خداوندگار یافت

مہ روشنی، و مہر فروزش ز سر گرفت | لیل و نہار صورت لیل و نہار یافت

بہرام دل بہ بستن تیغ و کمر نہاد | ناہید ذوق ورزش مضراب تار یافت

نظارہ فتنہ ہای عیان از نظر سترد | اندیشہ گنجہای نہان آشکار یافت

جام از شراب، روشنی آفتاب جُست | بزم از بساط تازگی نوبہار یافت

روی سخن صفای بناگوش گل گزید | بانگ قلم نشاط نوای ہزار یافت

برہم زدند قاعدہ ہاے کہن بدہر | ہرکس نشاط تازہ ز ہر گونہ کار یافت

فیض سحر بہ غالب بادہ کش رسید | ذوق صبوح عابد شب زندہ دار یافت

رہزن متاع خویش بر ابن السبیل ریخت | کودک صفای لہو ز آموزگار یافت

گر زاہدست نیز ز سن مے بجام بُرد | ور مجرم ست نیز ز شہ زینہار یافت

با فتنہ ہم مضائقہ در خرمی نرفت | خود رخصت خواہش از رگ گل پود و تار یافت

دولت سپند سوخت کہ شد ملک تازہ روے | ملک آفرین سرود کہ دولت مدار یافت

از انتظام شاہی و آئین سروری | سور و سرور رونق و داد انتشار یافت

برخستگان ہند بہ بخشود از کرم | وکٹوریا کہ رونق از کردگار یافت

شکوۂ تغافل و عدم توجہ بہ نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رام پور در زمانہ سختی و بے نوائی
کہ بعد از فتح دہلی روزے چند روے دادہ بود

چون نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل — دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

در بادیہ بر گورِ غریبان ز چہ سوزد — آن شمعِ فروزان کہ بود در خورِ محفل

زان خسروِ خوبان+ چہ قدر چشمِ وفا بود — صد حیف کہ شد نقشِ امیدم ہمہ باطل

افسانۂ غم گر بسرایم نبود عیب — با دوست کہ پیوستہ ہمی بُرد غم از دل

میگویم و ہردم زندم طعنہ کہ "تن زن" — "چون می ندہد داد ز فریاد چہ حاصل"

از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار — دل گفت کہ ہان شیوۂ عشاق فرو ہل

تا کس ننہد ظن کہ بہ شاہد بودم روی — حاشا کہ حکایت کنم از لیلیٰ و محمل*

شاہد بود آن دوست کہ اندر غزل او را — خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل

من نالم از آن دوست کہ در عالمِ انصاف — شایان بودش گویم اگر خسروِ عادل

او خسروِ خوبان بود و بندہ گدایش — او قلزم و عمان بود و من خسِ ساحل

خود ہر چہ سرودم ہمہ با دوستئ پیش — امید گہم بود بہر وادی و منزل

یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من — بربستہ بہ رویم درِ ارسالِ رسائل

ای یوسفِ ثانی کہ بود در ہمہ عالم — مشتاقِ جمالِ تو چہ دیوانہ چہ عاقل

+ نواب یوسف علیخاں مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب تحصیلِ علم کے لئے دلی میں آئے تھے اُس وقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا مفتی صدرالدین خاں مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ مرزا نے اس قصیدے میں اُس زمانے کو یاد دلایا ہے چنانچہ اسی قصیدے پر نواب ممدوح نے سو روپیہ ماہوار مرزا کے لئے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کی عمر بھر تک برابر جاری رہا ۱۲

* چونکہ تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے اس لئے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلیٰ و محمل کا ذکر نہیں کرتا یعنی معشوق کی طرف میرا روئے سخن نہیں ہے ۱۲

تا از دِ تو چوں آیم و دور از تو چہ سازم — ماندن ز تو دشوار و رسیدن بتو مشکل
(یعنی ارتقائے تو و اماندن)

اے کاش بکوئے تو چنیں روی نمودے — زینساں کہ فرو رفتہ مرا پائے دریں گِل
(یعنی در وطن خود)

چونست کہ گاہے نکنی روی بدیں سوے — از چیست کہ ہرگز نہی دایہ بہ سائل
(دریوزہ)

گرجاں وہم از غصہ تو دانی کہ بگیتی — حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل

خواہی کہ مرا نبگری؟ از دور بفرمائے — تا نزدِ تو آرند یکے طائرِ بسمل

از صنعتِ اُستادِ ازل داں کہ ز ہر سوے — چوں قبلہ نما سوی توام ساختہ مائل

غالب سخن نامِ من آمد ازل آورد — دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل
(یعنی قدیم و ازلی)

در فنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب — ایں آیۂ خاص ست کہ بر من شدہ نازل

من گنجم و گردوں بگِل اندودہ درم را — مے بیں درِ گنج ار چہ کشودن شدہ مشکل
(یعنے میرے دروازے کو تیغا کردیا ہے)

خود درخورِ ویرانہ بود گنجِ گراں مند — غم نیست گر آبادی دہلی شدہ زائل
(گنج گراں بہا)

ہاروت فسونِ نفسِ گرم چہ داند — اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل

آں را کہ صریرِ قلم ہوش رباید — دیگر نبرد ذوق ز آوازِ عنادل

توقیعِ بریلی بتو فرخندہ کہ من نیز — بستم بہ فرہ مندی خویش از کرمت دل
(یعنے فرمانِ الحاقِ بریلی برام پور) (اقبال مندی)

حاشا کہ ستانم ز رقم قاضی و مفتی — حاشا کہ پذیرم عملِ شحنہ و عامل
(یعنی عہدۂ قاضی و مفتی نمی خواہم)

بفرست خردمند کساں را بحکومت — در جیبِ گدا ریز قلیلے ز مداخل

ہر سال ازاں شہر بمن وایہ رواں دار — کز بہرِ ہمیں گشتہ در اقطاعِ تو شامل
(یعنی از محاصلاتِ بریلی) (جاگیر)

امید کہ لب تشنگی من نہ پسندی — زاں رشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل

زاں رشحہ یعنی مداد، مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط کتابت جاری رہے۔

امید کہ بپذیری و بر من نکنی قہر — نپذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل
امید کہ آں شیوہ نورزی کہ بگویم — کز دردِ دلم فارغ و از من شدہ غافل

کیفیتِ آغازِ موسمِ سرما

عیدِ اضحیٰ بسرِ آغازِ زمستاں آمد — وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز ہوا — محملِ مہرِ جہاں تاب بہ میزاں آمد
روز می کاہد و شب راست ہمی افزایش روی — موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد
آذر افروز و خز و اطلس و سمور بدوز — مہرمہ میرود اینک مہِ آباں آمد
ہند در فصلِ خزاں نیز بہارے دارد — گونہ گوں سبزہ و گل بندِ خیاباں آمد
دے و بہمن کہ در اقلیمِ دگر یخ بندد — اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد
نیشکر بسکہ صف آراست کہ در پویہ نسیم — گفت جانیست دگر سر زدہ نتواں آمد
نخلِ نارنج ز بینی کہ ہم از میوہ و شاخ — گوی و چوگاں بکف آوردہ بہ میداں آمد
تا برد داغِ غمِ ہجرِ شقائق ز دلش — گلِ صد برگ بہ دلجوئیِ دہقاں آمد

گر نہ ایں گرمیِ ہنگامہ تماشا دارد
از چہ نرگس پئے نظارہ بہ بستاں آمد

صفتِ موسمِ بہار

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستاں گیرد — دہد بہ نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد

برات بر زرِ گل کردہ اند پنداری — کہ غنچہ را سپہ سبزہ درمیاں گیرد

مگر نگرد گل از بہرِ پاس حلقہ زدہ است — کہ ژالہ را ز ہوا سبزہ بر سناں گیرد

ستادہ سرو بداں اہتمام بر درِ باغ — کہ تا بہار دگر راہ بر خزاں گیرد

ز ژالہ غنچہ بہ سرمست شاہدی ماند — کہ بعد بادہ شکر ریزہ در دہاں گیرد

چمن ز عکسِ شفق سا تگینِ مُل گردد — سمن ز جوشِ طرب رنگِ ارغواں گیرد

ز تند گرمیِ آتش بہ خارِ گل بالد — کشند گر ہمہ پیکر ز سنگ جاں گیرد

ز انبساطِ ہوا بعد ازیں عجب دارم — کہ مرغِ قبلہ نما جا در آشیاں گیرد

ز گل نگہ نتواں داشت دل بحیلۂ عشق — اگر ز ما نتواند ز دلستاں گیرد

چناں بکنجِ چمن یافت ذوقِ طاعتِ حق — کہ شیخِ شہر چو ما ترکِ خانماں گیرد

حریصِ جلوہ نگہ در ہجومِ لالہ و گل — چو آں گدائے کہ دنبالِ کارواں گیرد

چنیں کہ شاخ ہمی سینہ بر زمیں مالد — مرا کسے ثمر از دستِ باغباں گیرد

کیفیتِ صبح

صبحے کہ در ہوای پرستاری وثن — جنبد کلیدِ بتکدہ در دستِ برہمن

در رفتہ روے دیر دمِ گرمِ راہباں — آرد بروں گداختہ شمع از لگن

خیز نمی دستہ دستہ مغان نشستہ روی — درآرزوی چیدنِ † برسمِ زندون

از شورِ دیریان گمانِ خروشِ صور — اموات را ز رقص بتن بر دریدہ کفن

رخشندہ ستارہ از رخِ ناشستہ صنم — بالد بنفشہ از قدِ خم گشتہ شمن *

بر روی خاک جلوہ کند سایہ در نظر — بر بوی دوست حلقہ زند مرغ در چمن

خوابد چراغِ کشتہ چو شخص بریدہ سر — خیزد گلِ نشگفتہ چو رنجورِ خستہ تن

بر جامِ مل زدیدہ شبنم چکیدہ نگاہ — بر روی گل ز طرّہ سنبل فتادہ شکن

غوغای روز پردہ کشاید ز خوب و زشت — آوای کوس خواب رباید ز مرد و زن

فخر و خودستائی با شکوۂ بخت و گردوں

اِس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیر کی منقبت میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں۔ چونکہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق ناآشنا ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے اِسلئے نہ اُسکو اِس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ اول سے آخر تک نقل کیجا سکتی ہے لہذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار متضمن مضمون مندرجۂ عنوان انتخاب کرکے اِس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں

---

† برسم جھاؤ یا انار وغیرہ کی تیلی تیلی بالشت بھر کی شاخیں جن کو آتش پرست عبادت یا غسل یا طعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں ۱۲

* شمن بت ۱۲

اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی مشکل مقامات کی شرح بھی کیجائیگی۔

بند اول

آں سحر خیزم کہ ہر راد شبستاں دیدہ ام　　شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

اِس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اُس نور ظہور کے وقت میں آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے اسکو نہایت بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اُس سے ایک لطیف نتیجہ نکال کر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے۔ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اُسکی خوابگاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں یعنی کواکب یا ملائک کو اس گردندہ ایواں (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

اینت خلوتخانۂ روحانیاں کاندروے　　زہرہ را اندر ردائے نور عُریاں دیدہ ام

اینت کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے وخہے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے جہاں میں نے دُور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادر نور میں عُریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش　　تو لئے را در دو عشرتگہ دو مہماں دیدہ ام

ہر گدائے ناداں پر سوائی نہ بندی دل کہ من　　ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزاں دیدہ ام

اِن دونو شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے منجموں نے دورِ فلک کو بارہ حصّوں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے ہر ایک حصّے کو بُرج کہتے ہیں اور اُنکے نام یہ ہیں حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزاں، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ اِنمیں سے

ایک برج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال۔ مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں اور برعکس اسکے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے ثور اور میزان جن کا دوسرے شعر میں نام آیا ہے یہ دونو زہرہ کے خانے ہیں اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اسکے شرف کے مقام (یعنی ثور) میں اور کیواں یعنی زحل کو اسکے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا اور چونکہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں اس لئے اس مطلب کو اِسطرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (رنڈی) یعنی زہرہ کی دو عشرتگاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ میں نہیں ہے پھر دوسرے شعر میں دفع دخل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بیان کو کسی بُرے معنی پر محمول نکرنا چاہیئے بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے۔

رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغاں را بباغ　　　سر برسم خواب زیر بال پنہاں دیدہ ام

برسم خواب یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیر بال پنہاں یعنی بازو میں سر گھسائے ہوئے۔

کلک موجِ نکہتِ گل دم زگردش نازدہ　　　نامۂ فیضِ سحر نوشتہ عنواں دیدہ ام

موجِ نکہتِ گل کو کلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیضِ سحر کو نامہ یعنی خط ٹھیرایا ہے۔ کہتا ہے

کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں نے فیضِ سحر کا مکتوب جسکا اُسکا سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیضِ سحر ابھی عام نہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا۔

شانۂ بادِ سحرگاہی بہ جنبش نامدہ   طرۂ سنبل ببالیں بہ پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں بادِ سحرگاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جسکے ملائم جھوکوں سے گویا سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیمِ صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرۂ سنبل بالینِ راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

باد سرمستانہ می جنبید و شبنم می چکید   غنچہ را در رختِ خواب آلودہ داماں دیدہ ام

یہ اُس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے کہتا ہے کہ ہوا رسان رسان چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جسکی وجہ سے میں نے غنچہ کو رختِ خواب میں آلودہ داماں دیکھا یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اس لئے وہ گویا اپنے رختِ خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبحِ اوّل گو برُوئے کس نیاورد از حیا   صبحِ ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

یہ اُن تمام عجائبات کی جو آخرِ شب اُسکو نظر آئے اُنکی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبحِ اوّل (یعنی صبحِ کاذب جو گویا کہ شرم و حجاب سے ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا کے اصل بھید منہ پر نہیں لائی مگر صبحِ ثانی یعنی صبحِ صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خنداں

دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نقشِ فریب سیمیائی جلوے تھے جنکو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور
اوسی لئے صبحِ صادق اُنپر خندہ زن تھی۔ اِسکے بعد بند کو اِس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور
کہتا ہے۔

محرم رازِ نہان روزگارم کردہ اند　　　تا بجرم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھکو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اس لئے کہ کوئی میری بات
نہ سُنے اور پوشیدہ راز ظاہر ہونے پائیں مجھکو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے۔

از بند سوم

روشناسِ چرخ در جمعِ اسیرانش منم　　　نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اُسکا روشناس اور پہچاننے والا صرف میں ہوں؛
گویا میں اُس زنداں کے روزنِ دیوار کی جسمیں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں۔
آنکھ کا نور ہوں۔

ثابت و سیارِ گردوں را رَصد بستم بہ علم　　　رشتۂ تسبیح گوہرہای غلطانش منم

چونکہ رَصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں اِس لئے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے
ثوابت و سیارات کی رَصد باندھی ہے تو گویا میں اُسکے گوہر ہائے غلطاں (یعنی کواکب)
کی تسبیح کا ڈورا ہوں جسکے سبب سے تمام ستارے مثل دانہائے تسبیح کے منتظم ہو گئے ہیں۔

نے ز دانش کامیاب و نے ز بختی تنگدل　　　شرمسارِ کوششِ برجیس و کیوانش منم

اہلِ نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا افاضہ کرنے والا ہے اور کیواں یعنی زحل

یعنی اور مصیبت کا سمجھنے والا ہے کہتا ہے کہ میں علم سے کامیاب ہوں اور بدبختی اور مصیبت
گھبرانے والا ہوں تو گویا مشتری اور زحل دونوں کی کوشش میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں
اور اسلئے میں ان دونوں سے شرمندہ ہوں۔

در لئیمی شہرۂ دہر از تہیدستیست چرخ　　　رفتہ مسکیں از یاد و گنج پنہانش منم

کہتا ہے کہ آسمان جو لئیمی اور بخل میں مشہور ہے یہ اسکی تہیدستی کا نتیجہ ہے کیونکہ اسکے پاس
دینے کو کچھ باقی نہیں وجہ یہ کہ اسکا گنجینہ پنہاں میں تھا سو وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھکو بھول گیا
ہے۔ مسکیں سے مراد خود آسمان ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھکر بھول گیا۔

در غریبی خویش را از غصہ در دل می خلم　　　خوردہ ام از شست غم تیر یکہ پیکانش منم

یعنی عالم غربت میں بسبب غم کے میں خود اپنے دل میں چبھتا ہوں گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر
میرے آکر لگا ہے کہ خود میں ہی اس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دورباش پاس وضع　　　خانہ دارم کہ پندارند دربانش منم

دورباش۔ ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب امرا و سلاطین کی سواری کے آگے آگے
پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعرا اسکو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت کے معنوں میں
استعمال کرتے ہیں کہتا ہے کہ پاس وضع مجھکو گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا
بس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اسکا درباں میں ہی ہوں۔

پایۂ من جز بچشم من نیاید در نظر　　　از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بند چہارم

چوں بفیروزی ہمی گوئم سخن ہیچم مایہ نیست	تجربہ زم ہیچم زیاں گر چرخ کج باز دمن

بر تنش دستے تواند بود- زاں بالاترم	دل بباز دم- شیرِ گردوں پنجہ گر یازد بمن

پہلے مصرع کی تقدیرِ عبارت یہ ہے "من ازاں بالاترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود" شیرِ گردوں سے مراد خود گردوں یا برج اسد یا مریخ- پنجہ یازیدن دست دراز کردن و حملہ نمودن- دل باختن بیحواس شدن۔

ہر کرا گردوں بلند اوانہ تر خواہد بدہر	نوبتِ شاہی دہد وانگاہ بنوازد بمن

بنوازد بمن- یعنی اسکو میرے ذریعے سے معزز کرتا ہے دوسرے شعر میں اسکی تشریح ہے۔

پادشاہاں را سخن گفتن بکارِ ہر کس ست	دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن اندازد بمن

ورتو گوئی پادشہ را مایہ نبود- بیم نیست	خود بشاہاں مایہ بخشم گر بپردازد بمن

آنکہ چوں در ملکِ ہستی سکۂ شاہی زند	سکۂ شاہی بطغرائے یداللّٰہی زند

قولہ "پادشہ را مایہ نبود" اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطینِ عہد اس قدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں، اور یا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ مرحوم جو اس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور بادشاہ کے لقب سے ملقب تھے وہ گردشِ روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولہ "گر بپردازد بمن" بپردازد کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی "آنکہ چوں در ملکِ ہستی الخ" مراد اس سے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؑ ہیں جنکی منقبت میں مرزا نے یہ ترکیب بند لکھا ہے ✤

قطعات

ہزار معنیِ سرجوش خاص نطق من ست کز اہل ذوق دل - و گوی از غزل بُردست
ز رفتگاں بہ یکے گر توارُدم رُو داد مداں کہ خوبیِ آرایش غزل بُردست
مراست ننگ ولے فخر اوست کاں بہ سخن بسعیِ فکر رسا - جا بداں محل بُردست
مبر گمان توارُد - یقیں شناس کہ دزد متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بُردست

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار ساقی و مغنّی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے - و نبی را بدرودے

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم مخلصِ صادق الولاے تو من
گر ترا شیوہ شاہدی بودے کردمے جان و دل فداے تو من
ور ترا پیشہ شاعری بودے شُدمے چشم و سرپاے تو من
ور ترا پایہ خسروی بودے سُفتمے گوہرِ ثناے تو من
چوں ازیں ہا نۂ - مرا چہ ضرور کہ شوم ہرزہ مبتلاے تو من
راست گویم - بہانہ چند آرم ناصحِ مشفقم براے تو من
بسکہ بر مال و جاہ مغروری نیستم خوش ازیں اداے تو من

چکنی؟ کایں فسادِ سیم و زرست | واے من! اگر بوم بجاے تو من
بتو ہرگز ندادمے زر و سیم | خواجہ! اگر بودمے خداے تو من

دیدی آں ہرزہ گر و مہر و ولایش بہ یزید | کہ بخشم آید-اگر زشت و پلیدش گویند
زاں کہ او خود بسرِ ابنِ علی تیغ زاند | خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند
گفتم البتہ کہ شبیر بداں می ارزد | کہ شہیدش بنویسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند | نتواں کرد گوارا کہ شہیدش گویند

کردۂ تجدید کہ در ویرانے کاشانہ ام | چرخ در آرایش ہنگامۂ عالم نکرد
گر بہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا بر خود مپیچ | زانکہ حرفے-زانچہ گفتم-خاطرم خرم نکرد
تیغے از استاد دیدم ذوق لگے بخشید-لیک | ہیچ در تسکیں نیفزود و ز وحشت کم نکرد
ہمچو تو نا قابلے در صلب آدم دیدہ بود" | زاں سبب ابلیسِ ملعوں سجدہ بر آدم نکرد"
حاش للہ! بودنت در صلبِ آدم تہمت ست | پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نکرد

ایا زیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت | نمی رسد ز تو خار و خسے بہیچ سبیل
چو لازم ست کہ پروردگار تا دمِ مرگ | بود بہ رزق ضروریۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری زر از سیاہ و سفید | چراست اینکہ نیابی برات کثیر و قلیل

قتادہ در سرِ این رشتہ عقدہ - ورنہ | نہ مردہ تو - ونے رازقِ العباد بخیل
ز چند سال بمرگِ تو و تباہیِ رزق | شدست حکم - خود از پیشگاہ ربِ جلیل
فرشتۂ کہ وکیل ست بر خزائنِ رزق | نکرد ہیچ توقف بہ رزق در تعطیل (یعنی در تعطیل رزق توقف نکرد)
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقروں باد (یعنی ملک الموت) | روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل
لطیفۂ کنم از قولِ شاعرے تضمیں | کہ در لطیفہ مرا در اکسے نبودہ عدیل
"اگر خداے براند کز ندۂ تو ہنوز | ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل" (ملک الموت)

بہ آدم زن - بہ شیطاں طوقِ لعنت | سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیریِ طوقِ آدم | گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں - مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ہی ہے جسکا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے - نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مراد کا جو عنفوان شباب میں گذر گیا تھا ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے جو اُسکے کلیات میں موجود ہے اور چونکہ نظیری کو اُسکے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اُسکی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے اُنکے جلدو میں پائے ہیں اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اُسکا مرثیہ کمال صدقِ دل سے لکھا ہے -

مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا - جو عین نشو و نما کے زمانے میں فوت ہو گیا تھا - مرثیہ اسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے - چونکہ دونو ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیہ میں لکھے گئے ہیں اور دونو کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور دونو کا ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے اس لئے ہم یہ دونو نظمیں مقابل یکدگر لکھے دیتے ہیں تاکہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے دونو میں باآسانی موازنہ کر سکے - مگر افسوس ہے کہ کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہمکو دستیاب نہیں ہوا لہذا جیسا کچھ لکھا ملا پایا نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جنکی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ ان میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

غالب	نظیری
ایدل بچشمِ زخمِ حوادث فگار شو	لب خوش نگشتہ خندہ رہ چنگ میزند
اے چشم از تراوشِ دل اشکبار شو	در بزم مرگ خندہ بر آہنگ میزند
اے خوں بدیدہ در رو گدازِ جگر فرست	ہرگز زمانہ جامۂ ماتم بروں نکرد
اے دم بسینہ دودِ چراغِ مزار شو	تا رفتہ شب بدامنِ شب چنگ میزند
اے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ سازدہ	وقتِ گذشتہ را بتاسف ز پے مرو
اے سر بعقبۂ خاکِ سرِ رہگذار شو	کاینجا نشاط گام بفرسنگ میزند
اے خاک! چرخ گر نتوان زد ز جا درآ	ایں دہر رو بکوچ کشش آلم خم باد
اے چرخ! خاک گر نتواں شد غبار شو	دستِ طمع بگیسوی [illegible] میزند

غالب	نظیری
اے نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں غلط	دستِ اجل تیغِ سیاست بُریدہ باد
اے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو	از خاک مُہر بر دہنِ تنگ میزند
اے ماہتاب روی بہ سیلی کبود کن	آرایشِ جنازہ و دستار میکنند
اے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو	گوئی کہ گل برافسر داورنگ میزند
اے فتنہ بادِ صبح وزید ایں قدر مخسپ	ایں چرخِ شوخ دیدہ عجب بے بصارت است
اے رستخیز وقت رسید آشکار شو	بر جامِ عشرتِ کہ؟ ببیں سنگ میزند
آہ ایں چہ سیل بود کہ ما را ز سر گذشت	فرزندِ شاہ اکبر والا نژاد مُرد
تنہا نہ سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت	شیوں بر آورید کہ سلطان مراد مُرد

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پر شوکت و شاندار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعتِ شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے مگر واقعہ کی عظمت جس قدر بیان ہونی چاہیے تھی اُس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے بخلاف نظیری کے کہ اُسکا بیان اگرچہ سیدھا پھیکا معلوم ہوتا ہے مگر متانت اور اعتدال کا سررشتہ اُسنے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب	نظیری
بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار	آفاق پُر دریغ و جہاں پُر ندامت است
با پادشاہِ عہد چہا کرد روزگار	ایں روزِ مرگ نیست کہ روزِ قیامت است

غالب

شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را
در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار

شاخے کہ بود موسمِ آنش کہ بر دہد
از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار

مرگ اینچنیں رخ و تنِ نازک ندیدہ بود
کامِ اجل بہدیہ روا کرد روزگار

شہزادۂ خرد سال و بود روزگار پیر
شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار

فرزندِ پادشہ نشناسد معانقہ ؎
آغوشِ گور را بہر چہ وا کرد روزگار

اے آں کساں کہ خاکِ رہِ شہریار را
توجیہِ آبروے شما کرد روزگار

ہر چند بے اجل نتواں ہیچ گاہ مرد
آتش بجود زنید کہ فرخندہ شاہ مرد

نظیری

خلقے پر اضطراب چہ جای سکون ست
دہرے پر انقلاب چہ جای اقامت ست

ایں ماتمِ کسے ست کہ از گریہ تا بحشر
برجیبِ صبح و دامنِ شبہا علامت ست

خوں میکند بجلوہ دلِ خلق گوئیا
نخلِ جنازہ رستہ ازاں نخلِ قامت ست

ہر کس چنیں جمال درآرد بحشرگاہ
رضواں گرش بہشت دہد در غرامت ست

دل از نوید صحتِ او بزمِ سور بود
اکنوں سرائے ماتم و کوئی ملامت ست

یاراں! عجب تبہ کاری از دست دادہ ایم
بر سر زنید دست کہ وقتِ ندامت ست

شہباز ما پریدہ رہِ آسماں گرفت
مرغے ز رفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

یہ دونو بند سادگی اور مرثیت میں تقریباً برابر سرابر ہیں۔ البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر

؎ یہ اشارہ ہے اس دستور کی طرف کہ خاندانِ تیموریہ کے سلاطین اور شاہزادے کسی سے معانقہ نہیں کرتے تھے۔

جس رتبے کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب	نظیری
اے قوم! خویش را بہ شکیب امتحاں کنید	اے بزمِ تیرہ! آں رخِ چوں ارغواں کجاست
ایں کار را بہ شیوۂ کارآگہاں کنید	وے رزمِ درہمی! آں شہِ گیتی ستاں کجاست
طفل ست شاہزادہ و در رہ خطر بسی ست	شوقِ سجود و حرمتِ تعظیم کمتر ست
منعش ز عزمِ رہروی آنجہاں کنید	آں نازِ صدر و سرکشیِ آستاں کجاست
از میوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید	امروز غم بہ مسندِ شاہی نشستہ است
از حیلہ آنچہ رای شما باشد آں کنید	پہلو نشینِ خسروِ ہندوستاں کجاست
ہر حرف دلنشیں کہ بگوئید و نشنود	آں حکم ہا کہ بود ازو آبِ کار کو؟
آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید	واں کار ہا کہ آمد ازو بی جاں کجاست
ور خود ز رفتنش نتوانید باز داشت	دلہا پر از غم ست عزیزاں! چہ واقع ست
بیخود شوید و جامہ درید و فغاں کنید	یک دل شگفتہ نیست خوشی در جہاں کجاست
گیرید دشنہ در کف و ہم بر جگر زنید	ہر جا بسوگِ مرگِ گروہے نشستہ اند
تا سینہ را ز دیدہ فزوں خونچکاں کنید	زیں غم کہ عام گشت ندانم الم کجاست
دنبالہ پیشِ شاہ مگوئید و بخبر	برگ و شگوفہ ریخت۔ ثمر از کجا خورم
تابوت را بجانبِ مرقد رواں کنید	بشکست شاخ و برگ، سرِ آشیاں کجاست

غالب

اے اہلِ شہر مرفن ایں دودماں کجاست؟
خاکم بفرقِ خوابگہِ خسرواں کجاست؟

نظیری

کس را سرود و درخور ایں تعزیت نبود
پیدا کنید کا قوال ایں داستاں کجاست
خلقے نشیمن اند و نگویند حال چیست
صبر سخن شنیدن و تاب بیاں کجاست
آفاق در مصیبت او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعثِ الم مرد و زن شدہ

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کردئے ہیں نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو مگر مرزا کے بین نہایت دل خراش ہیں متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں اسکو جانے سے روکو وہ جو کچھ مانگے اسکو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو وہ کرو اور اگر سیدھی طرح وہ کہنا نہ مانے تو اسکو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے تو۔ دوڑو اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کئے بغیر تابوت مرقد کی طرف لیجاؤ؛ یہ تمام پیرائے بیان کے نہایت مؤثر اور دل خراش ہیں اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے۔

بند چہارم

غالب

زاں سبزہ خط کہ بر رخ او نادمیدہ ماند

نظیری

غم خاست۔ در پیالۂ ما از ساغر افگنید

غالب

گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند
بستانیاں بماتمِ شہزادہ بیخود اند
زیں رُو بود کہ پیرہنِ گل دریدہ ماند
خوں گشت و در دل و جگرِ دوستاں فتاد
آں بادہ ہائے ناب کز و ناکشیدہ ماند
در مدحِ شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر
دردا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند
در وادیِ عدم نتواں رفت با حشم
ماند انچہ بود و صاحبِ عالم جریدہ ماند
زاں گلبنے کہ صرصرِ مرگش ز پا فگند
خارے بیادگار بدلہا خلیدہ ماند
اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشینِ خلق
بوئے ازاں شگفتہ گلِ نو رسیدہ ماند
آں سروِ سایہ دار کہ بالش نبود - کو؟
واں نو گلِ شگفتہ کہ غازش نبود - کو؟

نظیری

شد بزم تیرہ - پردہ ازاں رُخ برافگنید
شمعے کہ دہر روشن ازو بود - مُردہ است
پروانہ را بریدہ و بخاکستر افگنید
در خانہ آتش ز حلقۂ ماتم حرام نیست
ایں حلقہ را ز صحنِ سرا بر در افگنید
ریحانِ جلوہ یاسمنِ عشوہ ریختہ
چینید و ہم بر آں قدِ جاں پرور افگنید
بالیں ز تاب کاکلِ آشفتگی کشید
کوتہ کنید و عرصہ بدہ در کشور افگنید
رفت آں سرے کہ تاج باو سرفراز بود
بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید
پوشید چند جامۂ نیلی ز جورِ چرخ
بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید
خیزید تا بآں سرِ تابوت دم زنیم
عرضے کنیم و کارِ دو اعش بہم زنیم

اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت

ے گیا ہے جیسا کہ اصحابِ ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بندِ پنجم

غالب	نظیری
دستے ست ای سپہر ترا در ستمگری	رفتی و کارہا ہمہ درہم گذاشتی
بارے برم ز جورِ تو پیش کہ داوری	آشفتگی بہ مردمِ عالم گذاشتی
نیرنگ سازِ چرخ کہ بیداد خوی اوست	جانہای غم رسیدہ و دلہای بیقرار
باگل کند سمومی و با شاخ صرصری	در پیچ و تابِ طرۂ پُرخم گذاشتی
داغم ز روزگار کہ شہزادہ برنخورد	از تو غبار بر دلِ بیگانہ نہ بود
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری	بہرِ چہ بر دلِ پدر این غم گذاشتی
حیف ست مُردنش کہ در ایامِ کودکی	روز و شب برسمِ جنیبت ستادہ بود
بود اوستادِ قاعدۂ بندہ پروری	در زینِ خویش اشہب و ادہم گذاشتی
شہ در دہ و دو سالگیش کردہ کدخدا	شمعِ مزار و خشتِ لحد ساختی قبول
با فرِ خسروانی و فر تابِ قیصری	رخسارِ تخت و طرۂ پرچم گذاشتی (علم ۱۲)
ناگاہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد	ہمت ترا بہ مُلک نیاورد سر فرد
امضا پذیر نا شدہ توقیعِ شوہری	عالم بہر کہ خواست مسلّم گذاشتی (یعنی جہانگیر ۱۲)
جز نوعروس صاحبِ عالم نیافتند	حرمت نگاہ داشتی و جای خویش را
دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بدختری	بہرِ برادرانِ مقدم گذاشتی

زیبائی و جوانی فرخندہ شاہ حیف — خون ست بے تو گریہ ہمہ دودمانِ من
آں نونہالِ سروقدِ کجکلاہ حیف — ہر دل کہ بے تو خوں نشود سنگ و آہن ست

اگرچہ یہ دونو بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں مگر متانت و جزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلہ غالب معلوم ہوتا ہے۔

بندِ ششم

غالب	نظیری
اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونۂ	اے شاہِ مصر دُور ز کنعاں چگونۂ
ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونۂ	اے یوسف از جدائیِ اخواں چگونۂ
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما	ہرگاہ جلوہ کردہ تقاضا چہ میکنی
اے خفتہ در نشیمنِ عنقا چگونۂ	با حسنِ شوخ در تہِ زنداں چگونۂ
زاں پس کہ با تو آب و ہوای جہاں نساخت	اسکندر از غمِ تو [illegible] شکستہ است
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونۂ	در زیرِ گل تو چشمۂ حیواں چگونۂ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی	اے پارۂ ز جان و جگر گوشۂ پدر
با حوریانِ آئنہ سیما چگونۂ	گشتہ جدا ز دیدہ و داماں چگونۂ
ما بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم	ما بارے از فراقِ تو در خون دیدہ ایم
از خویشتن بگو سے کہ تنہا چگونۂ	تو درمیانِ روضۂ رضواں چگونۂ
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خرد سال	آوازِ نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند

نظیری	غالب
اے بخت خوش بخواب پریشاں چگونۂ	بے باغ و قلعۂ و لبِ دریا چگونۂ
اینجات کار دفتر و دیوان حوالہ بود	بعد از تو شاہ خیل ترا بر قرار داشت
آنجا بگو ز پرسشِ دیوان چگونۂ	اینجا عزیز بودہ آنجا چگونۂ
قلزم سبک ثبات ترا آنجا ز شبنم ست	اے بعدِ مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے
در بحرِ گل تو قطرۂ باراں چگونۂ	پروانۂ چراغ مزارِ تو عالمے
بشنو کہ بانگ بہرِ تو بر حشر می زنند	
تا بنگریم در صفِ دوراں چگونۂ	
چوں کارِ رفتگانِ دگر نیست کارِ تو	
محشر شتاب میکند از انتظارِ تو	

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ نظیری کا یہ بند اُسکے تمام ترکیب بند کی جان ہے اگرچہ مرزا کے ہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں مگر تربیت کا رنگ نظیری سے بڑھکر پایا جاتا ہے۔

بندِ ہفتم

نظیری	غالب
فردا کلاہِ پادشہی بر سرِ تو باد	گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس

* خاندانِ تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص بادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شاہزادہ مرجاتا تھا تو اُسکی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اُسکی سرکار بدستور جاری رہتی تھی ۱۲

غالب

در نوحه شاعری کمکنید از من التماس
در پرده سنجی از دمِ خویشم رسد گزند
(همه سنجی)
در رهروی ز سایهٔ خویشم بود هراس
من میهمان و چرخِ سیه کاسه میزباں
دُردی خورِ بلاکم و تلخابه نوشِ یاس
باقی نمانده اشک چه گریم به های های
از کار رفته دست چه بر تن دَرم لباس
سرحلقهٔ پلاس نشینانِ ماتمم
اندوهِ همرهانِ شه از خود کنم قیاس
چوں بود بزمِ ماتمِ شهزاده بے خروش
من دم زدم ز تلخ نوائی بریں پلاس
از نوحه عرضِ لطفِ سخن میتواں گرفت
غالب سخن سرای و شهنشه سخن شناس
یارب جہاں ز فیضِ تو بابرگ و ساز باد
عمرِ ابو ظفر شهِ غازی دراز باد

نظیری

رسم العمل بروزِ جزا دفترِ تو باد
فردا که روزِ حشر برانگیزی از زمیں
دوش و کنارِ حور و پری محشرِ تو باد
روزی که کارها همه موقوفِ حق شود
جبریل کارساز و خدا یاورِ تو باد
وقتِ سوال گوش و لبِ منکر و نکیر
پُر از قبولِ نکتهٔ جاں پرورِ تو باد
آں حُلّه که آدم از و ذوالقدر یافت
گر رحمتِ دو کوں بود در برِ تو باد
مجموعهٔ عمل چو به محشر در آورے
کارِ تو راست همچو خطِ مسطرِ تو باد
مغز از بخورِ روی مزارت معطر است
بوے بهشت هم نفسِ مجمرِ تو باد
آدم بہاے تو نشناسد دریں جہاں
تسبیح قدسِ دلِ کاں گوهرِ تو باد
نخلِ ریاضِ مُلک که باب عزیزِ تست
(سے چھوٹے قسمت)

نظیری

سرسبز از دعاے ثنا گستر تو باد
کارش بہ حسنِ شاہدِ فرخندگی بود
ہر چند بر تو مرگ - بروزندگی بود

اِس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں افسوس ہے کہ اسوقت
کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہمکو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخہ کے
ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اُسکے ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے
اُنکی شرح کیجاتی جس سے ناظرین کو دونو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا لیکن
ہمارا ارادہ ہے کہ اگر اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرطِ زندگی اِس نقصان
کی تلافی کی جائے گی +-

اب ہمکو مرزا کی کلیات نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے۔
اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضاے مقام کے موافق نقل
ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے
مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی اُنکے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جنمیں سب سے بڑی
مثنوی ۹۲۰ بیت کی ہے اِس مثنوی میں - جسکا نام مرزا نے ابرِ گہربار رکھا تھا - اُن کا
ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چونکہ یہ اُنکی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر
میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت

نہیں پہنچی، صرف دیباچہ کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا مگر یہ مثنوی اُنکی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اِسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اِس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپاسے کز و نامہ نامی شود — سخن در گزارش گرامی شود

سپاسے کہ شوریدگانِ الست — دہندش بہ بانگِ قلم دل ز دست

سپاسے بہ پوزش در آمیختہ — ز دل جستہ و با دل آویختہ

سپاسے دوئی سوزِ کثرت رُبائے — سپاسے دل افروز بینش فزائے

خدا را سزد کز دروں پروری — بدیں شیوہ بخشد شناسا دری

خدائے کز آں گونہ روزی دہد — کہ ہم روزی و ہم دو روزی دہد

+++++ +++

رضا جوئے ہر دل کہ درویش ہست — ہوا خواہِ ہر رُخ کہ گردیش ہست

ز بخشد ز انبوہِ خواہندگاں — نیاید ستوہ از نیاہندگاں

خرد جنسِ ہستی فروشندگاں — دہد مزدِ بیہودہ کوشندگاں

رُباید دل آما ز دل دادگاں — کشد ناز لیکن ز افتادگاں

زبادے کہ بر دل وزد در نہفت — زباں را بہ پیدا در آرد بگفت

نگہ را کہ بیروں نباشد ز چشم — دہد بالِ پیدائی مہر و خشم

دل و دوست باہم گر دوختہ — دریں کیسہ کردار اندوختہ

یعنی درکیسۂ کہ از ہم دوختنِ دلِ دوست بہم رسیدہ - کردار مردم اندوختہ است ۔

روان و خرد باہم آمیختہ — ازیں پردہ گفتار انگیختہ

نہ زیں سو گہرہا شمردن تواں — نہ راہ اندریں پردہ بُردن تواں

+ + + + + + +

بہ نیروی نہ چرخ برہم زدن — نشاید ز دانستِ او دم زدن

یعنی بقوتے کہ ازاں نہ چرخ را برہم میتواں زد از معرفتِ الٰہی دم نمیتواں زد۔

گروہے بہ بندِ گہر یافتن — فرو بستہ دل در زمیں کافتن

یکے را دمِ تیشہ برکاں نخورد — یکے رہ بہ نایاب گوہر نبُرد

خرد کز جہانے ست بیشش خبر — نباشد ز عنوانِ خویشش خبر

نہ بیند جز ایں ہیچ بینندۂ — کہ ما را بود آفرینندۂ

نگارندۂ پیکرِ آب و گل — شمارندۂ گوہرِ جان و دل

بہ گردش درآرندۂ نہ سپہر — بہ گردوں برآرندۂ ماہ و مہر

رواں را بدانست سرمایہ ساز — زباں را بگفتار پیرایہ ساز

بشاہی نشانندۂ خسرواں — ز رہزن رہانندۂ رہرواں

بدانش بہ اندیشِ فرزانگاں — بہ مستی نگہدارِ دیوانگاں

جگر را ز خونابه آشام ده　　　نفس را به بیتابی آرام ده
شناسندگان را بخود رهنمای　　　هراسندگان را غم از دل زدای
نفسها بسودای او ناله خیز　　　جگرها به صحرای او ریز ریز
رگِ ابر را اشکباری ازوست　　　دمِ برق را بیقراری ازوست
زبانهای خاموش گویای او　　　نهانهای اندیشه پیدای او
خرد را که جوید شناسائیش　　　نگه خیره در برق پیدائیش
دوئی بی کفن مرده در رهش　　　خودی دادگر شحنهٔ درگهش

+++++++++

زهی هستیِ محض و عینِ وجود　　　که نازد به یکتائیش هست و بود
ز شاخابه کز قلزمی سر دهد　　　بهر تشنه آشامِ دیگر دهد
بیک باده بخشد ز پیمانهٔ　　　بهر ذره رقصی جداگانهٔ
جهانی ز طوفان بغرقاب در　　　هنوزش همان چین بگرداب در
گروهی ز مستی بغوغا درون　　　هنوزش همان می به مینا درون
اسیرش ز بندی که بر پای اوست　　　شناسد که بر تختِ چون جای اوست
شهیدش بخونیش از طرب بهره مند　　　بجز چشمِ زخمش نباشد گزند

+++++++

بهر لب که جوئی نوائی ازوست　　　بهر سر که بینی هوائی ازوست

اگر دیوسار یست بیہوش و ہنگ — کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ

(دیوسار یعنی گمراہ)

بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ — کہ بت را خداوند پنداشتہ

وگر خیرہ چشمے ست نیّر پرست — بہ دُردِ مے از جامِ اندیشہ مست

پرستش ازاں راہ جنبیدہ مہر — گزیں روز نش دوست بنمودہ چہر

(نیّر یعنی خورشید)

ز تاری دروناں اہریمنی — گروہے بود کز خرد دشمنی

زبس داد تا آشنائی دہند — بہ آتش نشانِ خدائی دہند

بہ تن ہا بہ آذر گرایش کناں — بہ دل ہا خدا را نیایش کناں

گروہے سراسیمہ در دشت و کوی — خداوند جوی و خداوند گوے

ز رسمے کہ خود را براں بستہ اند — بیزداں پرستی میاں بستہ اند

ز مہرے کہ نجواست در دل بود — پرستند حق گر بہ باطل بود

نظرگاہ جمعے پریشاں یکے ست — پرستندہ انبوہ - و یزداں یکیست

کدامی کشمش کاں ازاں سوی نیست — بہ دو نیک را جز بوی روی نیست

جہاں چیست: آئینہ الٰہی — فضائے نظرگاہ وجہ اللٰہی

بہر سو کہ روآوری سوی اوست؟ — خوداں رو کہ آوردہ روی اوست

از مناجات

بروزے کہ مردم شوند انجمن — شود تازہ پیوندِ جانہا بہ تن

رواں را بہ بینش نوازندگاں — بہ سرمایۂ خویش نازندگاں

گهرهای شهوار پیش آورند | فروهیده کردار پیش آورند
(پسندیده ۱۲)

ز نور یکه ریزند و خرمن کنند | جهان را بخود چشم روشن کنند

بهنگامه با این جگر گوشگان (یعنی عزیزان) | درآیند مشتے جگر توشگان (یعنی گدایی از جگرخوارگان ۱۲)

ز حسرت بدل برده دندان فرو | ز خجلت سرانداز گریبان فرو

دران حلقه من باشم و سینهٔ | ز غم هاے ایام گنجینهٔ

در آب و در آتش بسر بردهٔ | ز دشوارے زیستن مردهٔ

تن از سایهٔ خود به بیم اندرون | دل از غم به پهلو دو نیم اندرون

ز ناسازی و ناتوانی بهم | دم اندر رگ آتش زه پیوند دم

زبس تیرگیهاے روز سیاه | نگه خورده آسیب دوش از نگاه

ببخشاے بر ناکسی هاے من | تپیدست و درمانده ام واے من

بدوش ترازو منه بار من (میزان اعمال ۱۲) | نسنجیده بگذار کردار من

بکردار سنجی مفرماے رنج | گران باری درد غم مسنج

که من با خود از هر چه سنجد خیال | ندارم بغیر از نشان هلال (یعنی قمر ۱۲)

اگر دیگران را بود گفت و کرد | مرا مایهٔ عمر رنج ست و درد

چه پرسی چو آن رنج و درد از تو بود | همے تازه در هر نورد از تو بود

فروهل که حسرت خمیر من ست | دم سرد من زمهریر من ست

مبادا بگیتی چو من هیچکس | جحیمی دل زمهریری نفس

بپرسش مرا ہم افسردہ گیر | پرکاہ را صرصرے بُردہ گیر
پس انگہ بدوزخ فرستادہ داں | درآتش خس از باد افتادہ داں

پرسش سے مراد باز پرس قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنے رکھ اور یہ سمجھ کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پرکاہ کو بادِ صرصر اُڑا لے گئی اور یہ فرض کر لے کہ دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک تنکا دہکتی آگ میں گر چکا۔

دگر ہمچنیں ست فرجامِ کار | کہ مے باید از کردہ راندن شمار

یعنی اگر انجامِ کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے تو۔

مرا نیز یارا ے گفتار دہ | چو گویم براں گفتہ زنہار دہ
دریں خستگی پوزش از من مجوے | بود بندۂ خستہ گستاخ گوے

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے آپ مجھ سے مت چاہنا کیونکہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بیباک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شد۔ نگفتن چہ سود | چو ناگفتہ دانی نگفتن چہ سود
زباں گرچہ من دارم آماز تست | بہ تست ارچہ گفتارم۔ آغاز تست
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم | پرستارِ خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہریمنی | نبردم زکس مایہ در رہزنی
مگر مے۔ کہ آتش بگورم ازوست | ہنگامہ پرواز مورم ازوست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اسی سے میری زندگی

اِس مطلب کو اِس طرح ادا کرنا کہ "آتش بگیرم از دست" اور "پروازِ مورم از دست" منتہاے بلاغت ہے نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے اُسکو پروازِ مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اُسکی موت کی علامت ہے اِسی طرح نشۂ شراب کا عارضی نشاط آخرِ کار موجبِ ہلاکت ہوتا ہے۔

من اندوہگین و مے اندہ ربا — چہ می کردم اے بندہ پرور خدا
حساب مے و رامش و رنگ و بو — ز جمشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ — بدریوزہ رخ کردہ با غم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ — نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط — نہ غوغاے رامشگراں در بساط
بہاروزگاراں بہ دلدادگی — بہ نوبہاراں بہ بے بادگی
بہاروزِ باران و شبہاے ماہ — کہ بودہ است بے مے بچشمم سیاہ
اُفق ہا پُر از ابرِ بہمن مہی — سفالینہ جامِ من از مے تہی
بہاراں ہا و من در غمِ برگ و ساز — درِ خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پُربوی و رنگ — من و حجرۂ و دامنی زیرِ سنگ
دمِ عیش جز رقصِ بسمل نبود — بہ اندازۂ خواہشِ دل نبود

اگر با ہم رشتہ گوہر شکست — وگر با ہم بادہ ساغر شکست

چہ خواہی ز دلقِ مے آلودِ من — ببیں جسم خمیازہ فرسودِ من

ز نا سازگاری ز ہمسایگاں — بہ سرمایہ جوئی ز بے مایگاں

سر از منتِ ناکساں زیرِ خاک — لب از خا کبوسِ خساں چاک چاک

بہ گیتی درم بینوا داشتی — دلم را اسیرِ ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد — بہر بار زر ر پیل بارم دہد

کہ چوں پیل زاں جا بر انگیز مے — زرش بر گدایاں فرو ریز مے

نہ نازک نگارے کہ نازش کشم — بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

بریں عمرِ ناخوش کہ من داشتم — ز جاں خار در پیرہن داشتم

چو دل زیں ہوسہا بجوش آیدے — ز دل بانگِ خونم بگوش آیدے

ہنوزم ہماں دل بجوش اندرست — ز دل بانگِ خونم بگوش اندرست

چو آں نامرادی بیاد آیدم — بفردوس ہم دل نیا سایدم

دلے را کہ کمتر شکیبد بباغ — در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ

صبوحی خورم گر شرابِ طہور — کجا زہرۂ صبح و جامِ بلور

دمِ شب رو پیاسے مستانہ کو — ہنگامہ غوغاسے مستانہ کو

دراں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجائیِ شورشِ نای و نوش

سیہ مستیِ ابر و باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور در دل خیالش که چه　　غم هجر و ذوق وصالش که چه

چه منت نهد ناشناسا نگار　　چه لذت دهد وصل بی انتظار

گریزد دم بوسه انیش کجا　　فریبد به سوگند دینش کجا

برد حکم و نبود لبش تلخ گوی　　دهد کام و نبود دلش کامجوی

نظربازی و ذوق دیدار کو　　به فردوس روزن بدیوار کو

نه چشم آرزومند دلاله　　نه دل تشنهٔ ماه پرکاله

ازینها که پیوسته میخواست دل　　هنوزم همان حسرت آلاست دل

چو پرسش رگی را بکاود ز دل　　دو صد دجله خونم تراود ز دل

بهر جرم کز روی دفتر رسد　　ز من حسرتی در برابر رسد

بفرمای کاین داوری چون بود　　که از جرم من حسرت افزون بود

هر آئینه همچون منی را به بند　　تلافی فراخور بود نی گزند

بدین مویه در روز امید و بیم　　بگریم بدانسان که عرش عظیم

شود از تو سیلاب را چاره جوی　　تو بخشی بدان گریه ام آبروی

دگر خون حسرت بدر کرده　　زبان از ستایش قطع نظر کرده

گذشتم ز حسرت امیدیم هست　　سپیداب روی سپیدیم بست

که البته این رند ناپارسا　　کج اندیشه گبر مسلمان نما

پرستار فرخنده منشور تست　　هوادار فرزانه دستور تست

یعنی قرآن

به بندِ امید استواری فرست | به غالب خطِ رستگاری فرست

محمد کز آئینه روے دوست | جز اینش ندانست دانا که اوست
زہے روشن آئینهٔ ایزدی | که در روی نه گنجیده زنگ خودی
ز رازِ نہاں پردهٔ بر زده | ز ذاتِ خدا معجزے سر زده
تمنائے دیرینهٔ کردگار | بوے ایزد از خویش امیدوار
تن از نور پالوده سر چشمهٔ | دلے ہمچو مہتاب در چشمهٔ
بہر جام از تو تشنه جرعه خواه | بہر گام از و معجزے سر براه
کلامش بدل - در فرود آمدن | ز دم جسته پیشی بزود آمدن
خرامش بسنگ از قدم نقش بند | بسنگے که نا دیده پایش گزند
به دستش گشادِ قلم نا رسا | بکلکش سوادِ رقم نا رسا
دل امی جای زبان دیدگاں | نظر قبله گاهِ جہاں دیدگاں
برفتار صحرا گلستاں کنے | بگفتار کافر مسلماں کنے
بدنیا ز دیں روشنائی دہے | بعقبیٰ ز آتش رہائی دہے
بخوے خوش اندوه کاهِ ہمه | بآمرزش امیدگاهِ ہمه
ز بس محرمِ پردهٔ راز بود | بنزدیکی حق سرافراز بود
ز رازے که با وے سرود سروش | صدائیش بود در ازل بگوش

خہے قبلۂ آدمی زادگاں | نظرگاہِ پیشیں فرستادگاں
کسائی دہ نسلِ آدم بخویش | روائی دہ نقدِ عالم بخویش
بلندی دہ کعبہ بالاے او | گرامی کن سجدہ سیماے او
یمن روشن از پرتو روے او | ختن لبتہ چین گیسوے او
زبت بندگی۔ مردم آزاد کن | جہانے بیک خانہ آباد کن
محراب مسجد رخ آراے دیر | تہ اندیش خویش و دعا گوے غیر
توگوئی۔ زبس دل ز دشمن ربابت | کہ سنگ درش سنگ آہن رباست (یعنی [illegible])

نثرِ فارسی مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرّا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً کلیات نظم کا دیباچہ اور خاتمہ۔ مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں، اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید، اور جلالاے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ انکی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بینظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کرلیجائے [illegible]

تسلیم کرنی چاہئے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے
تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں
پیوندی آم کا مزا ڈھونڈھنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لایق
آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابو الفضل اور مرزا بیدل دونو کے
مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے۔
لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونو کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا ان کی
طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضای مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں ان کو
یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین
کے ذہن نشین کی جاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی نہیں ہے
اس لئے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ اُن اصحاب کی ضیافت طبع کیلیے
جنکو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اسکی کسادبازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے
مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہمکو امید ہے کہ یہ نمونہ اس
بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ووافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ
بہم پہنچایا تھا جیسا کہ نظم فارسی میں اُنکو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تا وقتیکہ اُسکو دلیل و برہان
سے ثابت نہ کیا جائے ایک بے معنی بات ہے لیکن ہمکو ان لوگوں سے جو وجدان صحیح او

ذوق سلیم رکھتے ہیں امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں۔

چونکہ مرزا کی طرز انشا پردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں اس لئے جہاں تک ممکن ہوگا ہم اُنکی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کرینگے جو صاف اور سلیس ہوں اور باانیمہ جہاں ضرورت ہوگی کہیں بین السطور میں کہیں برکیٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائینگے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں مثلاً صد کو سَد، شصت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آدر اور تدرو وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے اس لئے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقے کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثر فارسی کا انتخاب

از مہر نیمروز

خطاب زمیں بوس مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدح بادشاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کرکے اپنا درد دل بیان کیا ہے اور اس

خطاب کا نام خطاب زمیں بوس رکھا ہے۔ اُسکو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"قاآن شیوہ خاقانا! و خواقین خدایگانا! رُوی آوردن من از عدم بوجود بسودای گہرسنجی و گہر فروشی بود؛ کالائے بیش بہائے من درین چارسو روی روائی ندید؛ و متاع گرانمایہ مراد رین بازار ارزش ارزانی نشد؛ ناچار ہر چہ با خویش آوردہ ام۔ چون گویم کہ با خویش می برم۔ لختے در سفینہ ہا، و پارہ در سینہ ہا میگذارم و میگذرم۔ پس ازمن آن گنج شایگان را اگر ہمہ باد ببرد گو ببر، و اگر ہمہ خاک بخورد گو بخور۔ سینہ آرزوہائے جوان میرا مدفن ست، لمعہ نگاہ کرم چراغ گورِ غریبان باد۔

نیاگان نامہ نگار از تخمہ افراسیاب و پشنگ بودہ اند، و فرماندہان با فرّو فرہنگ فرو مُردن چراغِ ہستی نوردیدہ تور، بہ باد آستین کینہ کیخسرو و پشنگیان را روز سیاہ پیش آوردہ، خداوندان اورنگ و دیہیم را از ان برگ و ساز با جز تیغ لندہاگوں کمت نماند۔ بہ مرز و بوم بیگانہ روی آوردند، و بہ دستِ مزد تیغ زدن نان خوردند۔ ہم ازین نیستان ایوانان کہسار نشیمن سلجوقیان دگربارہ سر با فسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردندہ چنانکہ خوی اوست این نامداران کا دس کوس را نیز از پای افگند۔

در مشربِ ما خواہش فردوس نخوئی   در مجمعِ ما طالع مسعود نیابی

مرزا اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ اُن لفظوں کے بعد جنکے آخر میں واو یا الف ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی قدما کی طرح یاے زیادہ کرتے ہیں مثلاً رُو یا سُو یا پا اور جا کی جگہ روے سوے پاے اور جاے لکھتے ہیں۔

در بادهٔ اندیشهٔ ما دُرد نه بینی   در آتش هنگامهٔ ما دود نیابی

از واپسیان این قافلهٔ نیاے من - که در قلمرو ماوراء النهر، سمرقند شهر مسقط الراس وے بود - چوں سیل - که از بالا بپستی آید - از سمرقند بهند آمد. در دفترِ سپهبد شاه نشان ذوالفقار الدوله میرزا نجف خاں توقیعِ نوکریِ شاہش نوشتند، و بر پرگنهٔ پہاسو برات روزیِ وے و سپاهش نوشتند. پدرم پیشهٔ پدر خویش داشت، و هم در کارزار جا به گذاشت. همانا گلبن ثناے ترا نوآئیں نوا بلبلے همی بایست که مرا زمزمه سنج و دستان سراے آفریدند.

رباعی

غالب بگهر ز دودهٔ زادشمم   زاں رو بصفاے دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر   شد تیر شکستهٔ نیاگاں قلمم

خامم بسر که بفریبِ پندار آزاده روی بسخن لاابالیانه پرداختم. و اندازه ارزشِ سخن و پایهٔ والائی گوهرِ خویش نشناختم. سینهٔ من نفسے داشت برواں آسائی نسیمے که از نسترن زار وزد؛ زباں زدهٔ من - که دم تجزیه نابایست نزدم. و بنان مرا قلمے بود به دجله باری ابرے که از قبله خیزد بهیده کوشِ من - که باراں بشوره زار فروریختم.

باایں فروغ گوهر رخشانی نهاد   زیں ساں سیاه روز کرا کرد روزگار

با فرو فرهنگ بیگانه، و با نام و ننگ دشمن. با فرومایگاں همنشیں، و با اوباش همرنگ، پای بیراهه پوے. و زباں بیهوده گوے، در شکست خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار، دل پُر از خار خار، و دیده نشتر زار. نه دستگاهِ خودنمایانه آرایشے. و نه

سروبرگِ آزادانہ آسایشے ۔ سرگذشتِ ہرکس ہماں فرمانہاے اِمضاپذیرفتہ سرنوشتِ اوست ؛ ودرآنچہ برمن رفت دوستاں رابامن چہ جای سرزنش ، ومرابادشمناں چہ گنجائی (گنجایش) پرخاش ۔

لنگرگسست صرصروکشتی شکست موج دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

پس ازپنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزی رفتارِمن ازمسجدوبتخانہ گردانگیخت ، وخانقاہ و میکدہ رابیکدگرزد ؛ بفروغِ آں فرہ ایزدی کہ فریدوں رابہ فرتابِ دادگری دل افروخت ، ومرافرہنگِ سخن گستری آموخت ؛ بداں دَر✝ فرودم آوردند کہ تونیزچوں حلقہ چشمے بداں دَر داری ، ونتوانی کہ دیدہ برداری ۔ +

تاہمسایۂ ادیم سپہریاں درسایۂ من اند ، وتاخاک نشین آں دَرم فرشتگاں دررشکِ پایۂ من اند ۔ دردل ودیدۂ روشناں (ستارگاں) جاے من ست ، وبرسرماہ وستارہ پاے من ۔ درین گوشہ گزینی وخوشہ چینی نخست آیۂ رحمتے ـ کہ برمن ازبالافرودآمد ـ رودادنِ خجستگی زمیں بوسِ کیہاں خدیوِ خداداں بود ۔ دولت روے آورد ، بخت ازخواب جست ، حورچشم روشنی (مبارکباد) گفت ، رضواں رضاجوے آمد ، چرخ ازرفتہ عذرخواست ، روزگارازگذشتہ بحلی طلبید (معافی) ۔

نومیدی ازتوکفروتوراضی نہ بہ کفر نومیدیم دگربہ توامیدوار کرد

کالبدِ خاکی مراچوں پیکرِ گردوباد جانے درمیاں نیست ؛ ہمیں یک دودمہ سرگشتگی تماشادارد ، گرعندلیبِ گلشنِ تصویرم کہ بیوے گل زمزمہ ازوے نتواند دمید ، یاسبزۂ جوہرِ شمشیرم کہ بوزیدنِ

✝ اس دَرسے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو بادشاہ کے پیرتھے اور مرزا انکے مکان میں رہتے تھے ۱۲

شاہا ہر چند [illegible] بجز ثنا [illegible] ازل [illegible]

چہ قدر ناستوار بودہ و چہ مایہ بہ زور گسستہ اند.

شبے با دلِ دیوانہ کہ لختے (کسی قدر) از من ہوشمند تر ست گفتم کہ اگر گفتار نپذیرد ہی (یعنی اگر التفات بگفتار دہی) بشاہ [illegible]

بارگاہ عرضہ دارم کہ آئینہ رازم سرا می تواں نمود، و بندۂ سخن طرازم سرا می تواں ستود.

گفت اے ناداں ایں سخن از جاے دگر بود و ہنگام آں گذشت؛ اکنوں اگر ہمی توانی گفت

بگوے: اگر خستہ ام، مرہم می تواں نہاد، و مُردہ ام، جاں می تواں بخشید.

رباعی

شاہا ہر چند دایہ جوے (دریوزہ) آمدہ ام   دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام

ابرم کہ محیط را بجوے آمدہ ام   رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام

اگر چنانکہ بدورانِ توام، بروزگارِ فرزانہ جمشید بودمے، جمشید روزگار را آفریں گفتمے؛ و اگر بدانساں کہ ثناخوانِ شہریارم، فرّخ فریدوں را ستودمے، فریدوں چرخ و ستارہ را گواہ گفتمے. و دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت، و زند آورد، اگر من بدیں دم آذرفشاں جا داشتمے، آذر از دمِ من زبانہ (شعلہ) زدے، و از دلفریبیِ بیانِ من کس بشنیدنِ [illegible] نپرداختے. من بدیں فرّخیِ بخت کہ چوں تو خداوندِ کارفرماے دارم، ہر قدر بر خویشتن بنازم جا دارد؛ حسرت کردم، اگر ترا بدیں گرمیِ ہنگامہ بنازم، کہ ہمچو غالب بندۂ آتشیں نواے داری؛ اگر ہنر داد و التفات نمی دہی، جاے مردمکِ دیدہ من باز گزار، و در دل بیدوی [illegible] جاے

[illegible] حضرت [illegible] ثانی [illegible] آں خسرو [illegible]

بسیم و زر و لعل و گہر سنجیدہ اند، من آں خواہم کہ دیدہ وراں را دستوری دہی تا ازکشش و
کوشش نرنجند، ویکبار گفتارِ مرا باکلام کلیم بسنجند۔ + + + + + + + + + + + + + + + + + + +
پریشاں نوائیِ من در ستائشِ گفتارِ خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتارِ راست بگستاخی
گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم؟ کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردمے، وہیچگاہ بر خودگمان
کمالے نبردمے۔ سرمستیِ ذوقِ برگزیدنِ ایں والا نظر کہ برگزیدہ تست مرا از من بُرد، و
خامۂ بے پرواپوے را بدیں روش و آہنگ بخرامش و رامش آورد۔ + + + + + + + + + + + + +
ہمانا بلند نامیِ سلطانِ دہر در آفاق چشم داشت، کہ چوں منے را کہ بجادوبیانی شہرۂ آفاقم
بکرداری گزاری گماشت۔ من خود ازاں رو۔ کہ دل و زبانِ ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبانِ
شاہ است۔ دانم کہ انچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ۔ فرمانِ شاہ است۔

یعنی حکیم احسن اللہ خاں ١٢ — تحسین و آفریں ١٢ — کشمیر نگاری ١٢ — یعنی حکیم ١٢

پادشاہاں را ثنا گفتن نہ کارِ ہر کس ست	دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن اندازِ من

نامہ نگار کردار گزار را بہ تنومندیِ توفیقِ سرانجامِ خدمت۔ سعادتِ جاودانی، وخاقاں را
بسایۂ سوادِ ایں نگارش کہ ظلماتِ آبحیوان ست حیاتِ ابد ارزانی باد۔

فخریہ فقرے مرزانے مہرِ نیمروز میں جہاں سببِ تالیفِ کتاب لکھا ہے اُسکے آخر میں یہ
ظاہر کیا ہے کہ کسرِ نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر مَیں اپنی طرزِ بیان کی داد لوگوں سے
چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہوگی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائیگی اسکے بعد کہتے ہیں۔
"کالاشناسی را نہ آں آئین ست کہ نکوئی کالاے خویش از نظر اندازند، و پرکارِ یکتائی را

معموری ١٢

خاندانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی کیلیے مرزا کو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے تجویز کیا تھا یہاں اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ١٢

نہ آں دستورست کہ بر ہر پیکرے کہ خود کشند عشق نہ بازند. مگر مانی آں نقش را کہ خود میزد از اعجاز نمی شمرد؟ و آزر آں بت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بندۂ سپاس گزار باشم اگر قلم را بہر جنبش آفریں نگویم، و از سخن بہ ہر اندیشہ سپاس نہ پذیرم. رفتارِ کبک در تدرو دل از دست بُرد، و خرامِ ایں رعنا لعبت رقاص سرمست نکند؟ حاشا کہ خراشِ کلک بر ورق ایں مایہ ذوق انگیز تواند بود؛ تیر ست کہ بسنبلہ در حالتِ سرمستیِ تصمیم خود نمایانہ بنازمی خرامد. ایں پارسیِ آمیختہ بہ تازی- کہ از زمانِ چیرہ دستیِ عرب بر عجم در گیتی پدید آمدہ- خسروی گنجینۂ در بستہ بود کہ خامۂ من قفلِ درش را کلید آمد. پرویز کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بُردہ ام.

خسروی بادہ دریں دَور اگر میخواہی   پیش ما آے کہ تہ جرعۂ از جامی ہست

خود ستائی فروہلم، و بندِ پندار بگسلم. آوخ از آں روزگار کہ از خوی بنا سازی و از کار بیازی سپری شد، و داد از آں بیداد کہ در ورزشِ افزونیِ خشم و کام بر روان و ہوش رفت. از کار نرفتم ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بپرداختنِ ایں نمط- کہ خود را چوں سایہ بازمیں ہموار ساختہ ام تا پرداختہ ام- و بانگیختنِ ایں نقش- کہ چشم و دل و نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام، تا انگیختہ ام- دست از کارہای دگر کوتاہ ست، و دل از اندیشہ ہاے دگر بر کنار. نامہ نگار- کہ از کردار گزاریِ نگفتنِ دردِ دل روے آوردہ بود- باز بہ پاے سخن می آید، و جادہ کہ نشاں دادہ اند مے پیماید

---

† تصمیم اور احتراق منجمین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ ہیں۔ جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز آفتاب سے ۶ درجہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احتراق میں ہے اور جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی بہت احتراق کے ۴ ۴ ۳ دقیقہ کم ہو تو کہتے ہیں ستارہ تصمیم میں ہے الغرض ستارے کا تصمیم میں ہونا اُسکی عمدہ ترین حالت ہے ۱۲

نگرندگاں ہمہ تن چشم باشند، وشنوندگاں سراپا گوش.

طرزِ واقعہ نگاری مرزانے مہرِ نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کئے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اُسکی بھی لکھی جاتی ہیں۔

خانِ خطا با خویشتن سنجید کہ با قہرمانِ قومِ مغل مہر ورزد مہر انگیز نامہ رواں داشت، و گزیدہ ردِ شے را بہ نامہ بری و میانجی گری گماشت. فرستادہ آمد، و جہاں پہلوان قبل خاں را زمیں بوسید، و نامہ سپرد، و پیام گزارد. صرفہ در آشتی بود نہ در فروگذاشت.

قاچولی بہادر را بجاے خود نشاند، و بہمنانیِ نامہ آور توسنِ تیزگام سوے خطا راند. فرماندہ آں کشور سرانِ لشکر را بپذیرہ فرستاد، و مہمان را بخوشتریں نشیمن فرود آورد. دو پادشاہِ سپہر بارگاہ بر یک خواں نشستند. و ناں خوردند، و راوق آشامیدند. مگر خرد پیشہ قبل خاں را در اندیشہ گزشتہ باشد کہ مبادا خطائیاں زہر بہ بادہ آمیزند، و بدیں رنگ خونِ مہماں ریزند؛ در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن بروں آمدے و بہ ستیم شگوفہ کردے، و خوردہ و آشامیدہ از دہن فرو ریختے. چوں بہ بزم اندر آمدے دگربارہ ساغر گرفتے، و خوردنی از سر گرفتے. خطائیاں بہ شگفت فرو ماندہ کہ یارب ایں چہ نیرومند و زور آور کسے ست کہ از ما بیشتر می خورد و خورش را بروے گرانی نیست، و مے از ما افزوں تر می کشد و ہشیار تر از ماست. میکشاں دانند کہ چوں بادہ پر زور دمادم خورند، ہر چند ہر بار شگوفہ اندازند، نہ آنست کہ مستی روے ندہد، و تابِ مے و ز بوئیِ تفِ معدہ منش را بہم بر نزنند. شبے بادہ بر خرد زور آورد. قبل خاں ریشِ دارائے خطا کہ التاں خاں نام داشت۔

گرفت و بسوے خود کشید، و ناسزا گفت. میزبان خشم فرو خورد، و نزدیکانِ خود را که بہم آمدہ بودند از گستاخی باز داشت. بامداداں میہماں آہنگِ بازگشت بسر رود. میزباں کہ از بدمستیِ دوشینہ سرگراں بود۔ چنانکہ میزباناں دامنِ میہماں زود از دست ندہند، و آرزوے دیر ماندن کنند۔ نکرد. کلاہ ہاے گوہر آگیں، و کمرہاے زریں، و رخشندہ نگیں ہاے بیش بہا، و پیوستہ ہاے پرنیاں و دیبا پیش کشید. و بدرود کرد. ہنوز رہرو دور نرفتہ بود کہ بدآموزاں التان خاں را از جاے بردند، و برآں آوردند کہ قبل خاں را از راہ برگردانند، و بدرگاہ آورند، و کالبدش را بدشنہ و خنجر از ہم فرو کشایند. سخن بزمی گزارندہ ستارہ از سپہر فرود آرندہ۔ بدیں کار کمر بست و قبل خاں را براہ دریافت؛ و بباز آمدن فریفت. رمیدہ رام نشد، و از راہ برگشت. فرستادہ تنہا باز آمد و بفرستندہ خبر داد. بگروہے از گرداں و یلاں فرمان رفت کہ جلو گسیختہ بشتابند، و ہر کجا یابند اگر شادی ورادی نیاید بخواری وزاری آورند. مگر قبل خاں را براہ دوستی بود از دودۂ ستودۂ سلجوق۔ بکاشانۂ وے فرود آمد. و انم از بہر آسایش آہنگِ دو سہ روزہ آنجا پدرود داشتہ باشد خطائیانِ شوریدہ مغز دراں دہ رسیدند، و خاں را دراں خانہ دیدند. سخن بداں لابہ سازی کردند کہ خاقان فریب خورد، و خواست کہ سوے خطا برگردد. خانہ خدا کہ خرد از مہر قروں داشت۔ نہفتہ بادپائے پیش کشید و گفت کارہا دگرگون ست؛ رفتن بخطا خود ہیچ روے روا نیست؛ تنہا بدیں گروہ میاویز، و بریں بادتوسن نام برنشیں، و سوے ایل واوبوس بگریز. ناگزیر بخیماں کرد، و جانِ گرامی بتیزگامی

---

۳ یعنی کسیکہ لطف زبانی و حیلہ سازی ستارہ را از سپہر فرود آرد ۱۲

بمرد. خطائیاں روے بازگشتن نداشتند، پئے امیدگاہِ تگاپوے خویش برداشتند. خان
سپہر آستان بخت بآرامش جا رسید و خطائیاں سپس. باقاجولی بہادر و فرزانگان لشکر
(یعنی اس کے پیچھے)
سگالش رفت کہ چہ می باید کرد. انجامِ کار بہ سبید بدیکہ گر بدخواہاں را گشتند، تا از تحمیکہ
(مشورہ) (صواب دید)
گشتند چہ درروند.
(یعنی اسے دیکھیں اس حرکت کا انجام کیا ہو)
شہریار قبل خان از یک بانوے نکو دیدار۔ کہ از قوم قنقرات بود، شش پسر داشت.
نخستیں و دومیں بہ اوکین برقاق و قوبلہ خاں نام آور، و دیگراں بہ نامہاے دگر
روشناس. روزے نخستیں ایں دو برادرِ نام آور۔ ناگاہ از شکارگاہ از ہمرہاں جدا ہمی ماند
و راہ گم کردہ ہرزہ ہمی گردد. تاتارخانیاں۔ کہ غارتگری پیشہ داشتند، و پیرامن قلمرو مغول
ہموارہ راہ می زدند۔ با ایں شہسوارِ پریشاں رفتار بر می خورند، و چوں مے دانند کہ کیست
باسیری می برند، و بالتاں خانِ خطائی می سپرند. خان کہ دلے پُر داشت فرماں می دہد
(یعنی جس کا بیٹا تھا)
کہ شاہزادہ را بر خرِ چوبیں بہ میخ ہاے آہنیں بر دوزند، و تنِ نازنینش از رواں پردازند.
خداوندِ مغولستاں را کہ از پیش رنجور بود بہ جگرتابیِ ایں داغ درد افزود. چوں دانست
(یعنی قبل خان)
کہ ناکام ہمی باید مُرد دومیں پسرِ خویش قوبلہ خاں را بہ جانشینی گزید، و بہ کشیدنِ انتقامِ
خونِ برادر وصیت کردہ چشم از تماشاے جہاں پوشید. قوبلہ خاں تانگینِ سلیماں
بکف آورد بفراہم آمدن سپاہ فرماں نبشت. فرماں براں و کینہ خواہاں از ہر سوے
بہ تختگاہ روے آوردند.

---

† پئے برداشتن تعاقب نمودن۔ امیدگاہِ تگاپوے خویش یعنی کسیکہ در طلب او تگاپوے نمودند ۱۲

شہنشاہِ دانا دلِ دیدہ ور	کہ چوں لعل بودے سراپا جگر
بر اں شد کہ لشکر فراز آورد	بسوے خطا ترکتاز آورد
ز مردان و گردان و گُندآوراں (پہلوانان۱۲)	بہ جنبش در آورد کوہے گراں
ازاں رو کہ بایست خونریز شد (یعنی اسی وجہ سے کہ خونریزی ہونا ضرور تھا۱۲)	منش ہا بخوں ریختن تیز شد
دلیراں ز دشمن کُشی دم زدند	ز دم باد بر روے پرچم زدند
ز تا تار تا گرد انگیختند	بہ بُنگاہِ خانِ خطا ریختند

اتاں خاں دل و دست و عناں و سناں بکار در آورد، و خود را با سپاہے (سوکاف۱۲) از ستارہ بشمار افزوں تر (صفت۱۲) بہ پیکار در آورد. کوشید و کوشیدن سود نداشت؛ رقم فیروزی بنام قولیہ خاں کشیدہ بودند. شکیبائیِ گُسِل شکستے (موصوف۱۲) بر خطائیاں افتاد؛ عَلَم ہا واژگوں شد، و اندیشہ بگُریز رہنموں. جہاناباں اتاں خاں بہ گریختن جاں بُرد، و تن ہاے خستہ و دلہاے شکستہ ازمیاں بُرد. بشہر اندر آمد، و در بروے سپاہِ کینہ خواہ بست. قولیہ خاں و لشکریانش نہ آنمایہ برگ و ساز بہ پیکار بودند کہ در اندیشہ گنجد. سپاس گزارِ چرخ و اختر گشتند، و گرانبار و سبک عناں برگشتند. پادشاہ بچشم روشنی پیروزی سپاہ و رعیت را صلاے عشرت اندوزی داد. ہنگامہ جشن گرمی پذیرفت، و بزمِ سور آرایش یافت. خواہی ہنگامہ گرم کن و خواہی بزم آراے؛ مرگ را نہ آں خدنگ بہ کماں ست کہ خطا کند؛ قولیہ خاں را نیز بہنگامِ خویش ناوک بر نشاں خورد. چوں پسر نداشت برتان بہادر جاے پدر از برادر گرفت. بسکہ دلیر و مردانہ بود نامش از خاقی بہ بہادری در جہاں رفت. بروزگارِ جہانداریِ ایں شہریارِ دلاور برقِ اجل

خرمنِ ہستیِ قاجولی بہادر سوخت، و پسرش ارغوچی برلاس بپیرِ لشکری رُخ افروخت۔

روزے میانۂ امیر قزغن و امیر طراغاے دربارۂ اویوس و قشون سخن میرفت، و فرزانۂ فیروزی فرامیر تیمورِ دلاور با پدرِ ہمزباں بود۔ پدر را از گفتار باز داشتہ خود بشگرفی سخن سرائے شد، و بداں ہنجار زخمہ چند بر تارِ گفتار زد کہ امیر قزغن دراں شیوا بیانی و گہر افشانی بہ مہر دل بست، و آفریں زباں برکشاد۔ سخن گوے فرخیدہ ادا را پسر خواند، و ہمدراں بزم اولجاے توتر کاں خواہرِ امیر حسین نبیرۂ خویشتن را بآئین دیں و قانونِ شرع بوے سپرد، تا خویشی بر خوشدلی افزاید، و آمیزشے چون شیر و شکر درمیاں آید۔ امیر جہانجوے پس ازاں پیوستہ با امیر قزغن در بزم ہمنشیں و ہمدم و در رزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے۔ از نبرد آزمایانِ برلاس و دلاورانِ ختیابر کہ آں دست بُرد گزستے شگفتی فرو ماندے، و "دست مریزاد" گویاں براں دست و بازو آفریں خواندے۔ پس از امیر قزغن کہ دامادش تعلق تیمور ناگاہ در شکارگاہش کشت۔ جہاں پہلوانِ تہمتن تواں بہ تنہا دامنِ ہمت والا گرفت، و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہرچند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ | در عہدۂ رحمتِ خدائیم ہمہ
در جلوہ و ہدچنانکہ مائیم ہمہ | شائستۂ نفت و بوریائیم ہمہ

برادر زنِ صاحبقراں ہمانا امیر حسین نیز بوے پیوست، و عہد بست کہ ہرچہ از ملک و مال

---

† امیر قزغن نام یکے از امرائے چغتائیہ ۱۲ * امیر طراغاے نام پدر امیر تیمور ۱۲ § رباعی گویا آیندہ آنیوالے مضمون کی تمہید ہے ۱۲

و برگ و ساز گرد آید بریکدگر بخشش کنیم، و باہم جز مہر، و با قوم جز آزرم، و با خلق جز داد نہ ورزیم
بخوبی گرمیِ ایں دو گردِ دلاور و دو تسیر مردم گہر ہنگامہ گرمی پذیرفت، و گزیں دستگاہے
دستبردِ سپاہے فراہم آمد. صاحبقراں نہ از سادگی بلکہ از آزادگیِ دل با ہر یکے داشت. و
امیر حسین ہموارہ در کمین آں بودے کہ نیا زہ را از میاں بردارد، و بیکتائی علم دارائی افرازد.
از دیدہ وری بسگالشہائے آں نژند اندیشہ نا راستی پیشہ پے بردے، و از فرزانگی و مردانگی
نہ بہ نگاہ برو نیاوردے.

ستم بجاں کج اندیش میتواں کردن خجل ز رستی خویش میتواں کردن

روزگارے ورا زتر از رشتہ طول امل. با ملوکِ طوائف در گیر و دار و گریز و ستیز و آویز گذشت.
ہمگناں چشم براہ و گوش برآواز داشتند تا ایل سفندیار نیرو را از کدام سو چشم زخم رسد.
وزیرہ امیر حسین کہ جز بریو و غریو و رنگ و نیرنگ کاری نکرد، و در انبازی و دو مسازی فتنہ پردازی
و شعبدہ بازی شیوہ داشت. نیرنگ سازی اقبال عدو مال صاحبقران کشورستان را
نازم کہ ہم آں گروہ بے شکوہ را سو بسو پاے بسنگ خوردے، و ہم ایں گُردِ بے دستبرد را
جابجا دست از کار رفتے. صدرہ اتفاق افتادہ است کہ ایں نفاق پیشگانِ خرد دشمن
خون گرفتہ را از نژاد چغتا خاں دست گرفتہ بر تکیہ گاہِ خانی و مرزبانی نشاندہ اند، و زود نہ
دیر شمشیر بر سرش راندہ اند. تنہاے پیلتناں را مسند و نطع از پئے ہم مہیا بود، و سرہاے
سروراں را تازہ بالش ز خشت گور ہم پیکدگر آمادہ.

سیرِ ستارہ و روشِ چرخِ نیلگوں اینہا کند ہر آئنہ در مذہبِ حکیم

اما من آں نیم کہ پسندم طریقِ وہم	زاختر چہ شکوہ چوں نبود جز خدا قسیم
نبود بجز ظہورِ صفات و شیونِ حق	صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم
توقیعِ معنویست گر انصاف و رستم	تشریفِ خسرویست گر اطلس و گر گلیم
از حق بود افاضۂ ہستی بہر صفت	جز وایہ نبود آنچہ بہ سائل دہد کریم

ہمچنیں بارہا امیر حسیں را از درماندگی و زبونیِ کار (مغلوبی) سخت افتادہ است، و سلطانِ سام ہم آورد (موصوف، صفتِ اول) افراسیاب ہمتا (صفتِ ثانی) برلابہ گریِ وے بخشودہ بیاری و یاوری دل نہادہ است. کیں ہاے نہانیِ امیر حسیں آشکارا بود. ہمہ می دانستند، و خدیوِ ہمہ داں از ہمہ فزوں تر می دانست. دامِ کرم در ضمیرِ حق پذیرِ آزرمِ ناگزیر† می گذشتہ باشد کہ مگر ایں سست مہر خوہاے زشت و کردارہاے نکوہیدہ بگذارد، و جہاندار را دگر بار آتی و جہانیاں را پس بہ دراز دستی نیازارد. آں ناجوانمرد را فرۂ ایزدی کجا کہ بخشم و کام (یعنی حوائجِ شہواتِ نفسانی) نگرود، و راہِ دانش و داور رود. در آزردنِ دل آزرم (شرم) نداشت، و در بُردنِ زرِ شکیب، و در گشتنِ خلق پروا.

تو پارسا طلبی عاشق و من آں رندم	کہ مے بحلقۂ اوباش آشکار کشد

پایانِ کار لشکر پائش از ناخوشی ستوہ آمدہ آں جواں میرِ خداگیر* را با ہر چہار پسرش گرفتہ آوردند و بخداوندگار سپردند. دارای نبرد آزمای را آہنگِ عاجز کشی نبود و خوں گرمیِ پاداش (یعنی جوشِ انتقام) نداشت. می خواست بر نابخشودنی بخشودن و گناہانِ نابخشیدنی بخشیدن. از نہادِ اہلِ بزم خروش برخاست. خامہ شاہ محمد مرزبانِ بدخشاں، و شیخ محمد

† آزرمِ ناگزیر یعنی کسیکہ اورا از آزرم و مروت چارہ نباشد ۱۲ * خداگیر کسیکہ بغضبِ خدا گرفتار شدہ باشد ۱۲

بیان سلدوز، و امیر کیخسرو - که ریش ہاے نو و ناسور ہاے کہن داشتند - زخمہ تیز تر زدند، و بنوا ہاے خونچکانِ خونابہ فشاں فغاں برآوردند کہ ما قصاصِ خونہاے ریختہ می خواہیم نہ انتقامِ فتنہ ہاے انگیختہ کہ والیِ ولایت آں را بجل تواند کرد۔ ناگزیر بدیں گفتار فرجامِ گیر و دار بشرع حوالت رفت۔ کارآگاہاں و دانش پناہاں خوں ریختن فرمودند، و سادات و علما بہ کشتن فتوے دادند۔

پنداری چوں خوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد در دل اندیشیدہ باشد کہ خود را بگریختن از ہنگامہ بدر برد۔ و بپس دیوارِ زاویۂ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد۔ ازانجا کہ سلاح و سلب نداشت سراسیمہ از جا رفت، و از خرگاہ بدر آمدہ بجنگِ سیلی و مشت راہِ گریز پیش گرفت۔ خوں خواہاں بجوں گرمی در وے آویختند، و خونش را کہ بدویدن گرم شدہ بود گرماگرم برزمیں ریختند۔

توای ندیم کہ مانی ز تازہ روئی خویش | بسبزہ کہ سر از طرفِ جویبار کشد
فریبِ مہر ز گردوں مخور کہ ایں بے مہر | دہد فشار کسے را کہ در کنار کشد
ہواے تاجِ شہی ہر کرا بود در سر | سرے بدفنِ شاہانِ تاجدار کشد

شیر خاں را دل دگر بود و زبانِ دگر، بہ لابہ گری و فسوں گستری پیامِ آشتی درمیاں داشت۔ تا چناں شد کہ ہیچ کس را ستیزہ در اندیشہ نگذشتے۔ اناں گل و لاے کہ در راہ پیمودہ بودند و روز و شب از رہروی - نے مے از شناوری - سنیا سودہ بودند، پیادہ آزردہ پاے بودہ

یعنی از شناوری گل و لاے ۱۲

وسوار فرسوده اندام، دستور پشت ریش - فریبِ دوستی از دشمن خوردگان (یعنی همایوں و لشکریانش که فریب از شیر شاه خورده بودند) دست از غارت و تاراجِ غنیم کشیدند، و دمِ آسایش غنیمت شمردند. پا بیا به جادۂ زِه دامنِ آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیده بخواب رفتند) و پیکرہا چوں صورتِ دیبا به بستر پیوند پذیرفت. سر از بالش بر نمی خیزد تا کلاه و مغفر را چه کنند، و پیراہنِ حریر بر تن گران ست تا چلقه و جوشن کجا برند. ہوا نمناک بود، و ابر نمِ افشاں؛ تیغ در نیام زنگ بست، و نمد زیں بر بارگی گراں گشت. سپیده دمے که تیرگیِ تارِ میغ جہاں را فرو گرفته بود، ہنگامه سازانِ ہنگام جوے یکسره بر غنودگاں ریختند؛ شگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفه ہراہر در لشکر افتاد. کلاه از پیکر، و پاپوش از افزار نشناختند از رختِ خواب جسته، و بر اسپان بے زیں نشسته، پراگنده ہر طرف تاختند. گروہے "ہر چه باداباد" گویاں سواره خود را بدریا زدند، و ہنر ورے چند ساحل جویاں بشنا دست و پا زدند. تا کداماں بزخمِ دمِ تیغ و کداماں بخمِ موجِ رود مرده باشند. و کداماں از طوفانِ ایں دو آبه (یعنی آبِ تیغ و آبِ رود) جاں بسلامت برده باشند. شهنشاهِ بحر و بر (یعنی همایوں) نهنگِ دشت نورد دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فراز ساحل در آب افگند. پاے از رکاب و عناں از دست و اسپ از خم راں بدر رفت. و شاہسوارے - که شاہاں ہنگام سواری بوسه بر رکابش می زدند - غوطه در آب خورد. نظام نام آزاده از آب کشانِ لشکر که پنہاں از خویش اقبال را چشم براه و گوش بر صدا داشت (یعنی بے آنکه خبر داشته باشد منتظرِ عروج و اقبالِ خود بود) و با خویشتن درایں اندیشه که از ساحل چوں گذرد بر ساحل جا داشت

ہواخواہانہ بدان نجیستی - کہ گوئی گوے دولت بُرد - خو د را آب در زد - بارے بدانست آشکارا بینان سقاے سخت کوشے بود، و بہ والا دید معنی آشنایان فرخ سروشے بود کہ جہانباں را از گرداب بدر آورد و بر جہانیاں منت نہاد -

از دستنبو

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبو میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے - التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے - باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبو میں اپنی طرز خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا - چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبو کے چند فقرے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں -

"دریں روزگار - کہ ہر زمزمہ را ہنجارے و ہر رمہ را رفتارے، و ہر کجا سپاہے بود از سپہدارے، سخن پیوندی بگذار و بگوے کہ خود روز و روزگار بر گشت - اختر شناسان سپہر پیماے (یعنی منجماں) برآنند کہ دراں روزگار - کہ بزم نازیزدجرد شہریار پارس از ترکتازِ تازیاں (اہلِ عرب) بہم خورد - کیواں (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برجِ سرطان) انجمن آراے و ہنر آزماے بودند - اینک ہماں پایہ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں بہم پیوستن گاہِ (جاے قران) بہرام و کیواں ست، و ایں شورش و پرخاش و جنگ، و خواری و خونخواری و ذرنگ و نیرنگ، نمایہ (ظہور) آنست -

دانا بدیں گفتار گرود ؟ آں تاختنِ لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر، و ایں برگشتنِ

گرست از خداوندانِ لشکر، چنانکه از داستانِ باستانِ پارسایانِ پارس بہم نمانستنِ (عدمِ مشابہت) ایں دو ستیز و آویز ہویدائی دارد۔ و آں بارکہ سخن در کیش بود۔ ایرانِ ایں یغرۂ و فرہنگ کیشِ نو (یعنی اسلام) فرجامِ آبادی، و از بندِ آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ و دریں بار کہ گفتار در آئیں ست۔ ہندیاں بہ چشمداشتِ کدام آئینِ تازہ شادماں باشند؟ پارسیاں رُخ از آتش تافتند، و بسوے خدا راہ یافتند۔ ہندیاں دامنِ دادگراں (یعنی اہلِ فرنگ) از دست دادند، و بہ شکنجۂ دامِ ہمدمیِ دَداں (درندگاں) افتادند۔ نمی بینی کہ از دامن تا دام و از داد تا دَد چہ مایہ دوری ست؟ داد آنست کہ آرامش (راحت) جز در آئینِ انگریز چشم داشتن کوری ست۔ زخمِ تازیانۂ تازیاں از خوبیِ آں کیشِ فرّخ (اسلام) مرہمے داشت؛ روزگار درخورِ ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت، بار اندوہ از دوشِ دلہاے نژند (پریشاں و تباہ) برمیداشت۔ اگر در اندیشۂ رازداناں بہ ہرِ دانش وداد۔ ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست بمن نشاں دہند، و بر دلِ اندوہگینِ بیمناک سپاس نہند۔ جہانیاں با جہانباناں ستیزند، و لشکریاں خونِ لشکر آرایاں ریزند؛ و آنگاہ شادی ورزند، و بر خویشتن نہ لرزند۔ ہاں اے دانندگانِ فرزبودِ (حکمتِ الٰہی) آشناسندگانِ زیان و سود! ایں ہنگامہ بہ آتشِ خشمِ خداوند گرم ست؛ ورنہ کارزارِ پارس انچنیں امید سوز و آرزو گداز نبود۔"

"چاشتگاہِ دوشنبہ شانزدہم ماہِ روزہ و یازدہم مئی سالِ یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگرفت در و دیوارِ بارۂ (قلعہ) و بارۂ (فصیل) دہلی بجنبید و آں جنبش زمیں را فراگرفت سخن

شورش ۱۸۵۷

درزمین لرز (زلزلہ) مے رود؛ دراں روزِ جہاں سوز بخت برگشتہ و سرگشتۂ چند از سپاہِ
کینہ خواہ میرٹھ بشہر درآمدند؛ ہمہ بے آزرم و شور انگیز، و بخداوند کُشی تشنۂ خونِ انگریز و دیدبانانِ
دروازہ ہاے شہر - کہ پُرزوں (علاوہ) از نگوہری و ہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ ہم از پیش
ہم سوگند نیز باشند - ہم پاسِ نمک و ہم پاسِ شہر گذاشتند، و مہمانانِ ناخواندہ یا خواندہ را گرامی
داشتند. آں سوارانِ سرگرانِ سبک جلو (سبک عناں) و پیادگانِ تند خوے تیز دو چوں
در ہا باز و دربانان را میہماں نواز یافتند دیوانہ وار ہر سو شتافتند، و ہر کرا از فرماندہاں، و
ہر کجا آرامشگاہ آں مِہاں، یافتند تا از کشتن دو پاک نہ سوختند روے ازاں سوی برتافتند
کشتے گدایانِ گوشہ گیر، از بخششِ انگریزی توشہ گیر - کہ ناں با ترہ و دوغ می خورند، و در شہر
دور از یکدگر پراگندہ جابجا روزگار بسر مے برند (یعنی رعایاے شہر) ہمہ تیر از تیر ناشناسندگان
واز غوغاے دزد در تیرہ شب ہراسندگاں، نہ پیلارکے در دست، و نہ خدنگے در شست؛
اگر راست پرسی ایں مردم بہرِ آبادیِ کوے و برزن اند، نہ براے آنکہ بہ آہنگِ پیکار
دامن بہ کمر زنند؛ با اینہمہ ازاں رو کہ راہِ آبِ تیز رو بہ خاشاک نتواں بست، دست از
چارہ کوتاہ دیدہ ہر یکے در سراے خویش بماتم نشست. یکے ازاں ماتم زدگاں منم کہ در
خانۂ خویش بودم؛ چوں غریو و غوغا شنودم تا از ترہ وہش دم زدم، دراں مایہ درنگ کہ مژہ
برہم زدم، آوازۂ بخوں غلطیدنِ صاحب اجنٹ بہادر و قلعہ دار درانگ، (قلعہ) دو ویدنِ
سواراں و پیاپے رسیدنِ پیادگاں در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت. ہیچ مشتِ
خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان ارغواں زار نشد، و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی ماتم کدہ

نوبہار نشد. ہاے آں جہانداران دادآموز دانش اندوز نکوخوے نکونام، وآہ ازاں ماہ‌تابان پری چہرۂ نازک اندام، بارخی چوں ماہ وتنے چوں سیم خام؛ و دریغ آں کودکان جہاں نادیدہ- کہ در شگفتہ روئی برلالہ وگل می خندیدند، و در خوشخرامی بر کبک و تذرو و آہو مے گرفتند- کہ ہمہ یک بار بگرداب خوں فرو رفتند. اگر مرگ بر بالین ایں کشتگاں بمویہ (بگریہ) خروشد، و دریں سوگ سیاہ پوشد، رواست؛ و اگر سپہر خاک گردد و فرو ریزد، و زمیں سراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد بجاست.

اے نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط	اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے آفتاب روے بہ سیلی کبود کن	اے ماہتاب داغ دل روزگار شو

بارے چوں آں روز تیرہ بشام رسید، وگیتی تاریکتر گردید، سیہ درونان خیرہ کش (بخیرگی کشندہ) ہم در شہر جا بجا رخت تن آسانی انداختند، وہم در ارک باغ خسروی را آخر اسپاں ونشیمن شاہی را غرابگاہ خویش ساختند. رفتہ رفتہ از شہرہاے دور دست آگہی رسید کہ شوریدگان ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گاہ، (منزل) خون سپہبداں ریختہ اند. گروہا گروہ مردم را از سپاہی و کشاورز دل یکے گشت، وہمہ بے آنکہ باہم سخن بہ دو- دو زنزدیک یکدست بریک کار کمر بستند؛ وآنگاہ چناں پرزور کمرے وچگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبش جوشش خونے کہ از کمر گذرد گشادنہ پذیرد. پنداری ایں لشکرہاے بے مرد جنگجویان بیشمار را جاروب دار کمر بند یکیست. آرے رفت وروب ہند بوم ہماں ساں کہ آرامش و آسایش اگر جویند. باندازۂ پرکاہ گاہے نیابند ہمچنیں جاروب گیتی آشوب ہمی خواست.

اینک ہزار لشکرنگری ہمہ بے لشکر آرائے آراستہ، و بسا سپاہ بنی یکسرہ بے سپہدار بجنگ برخاستہ۔ توپ و گلولہ و ساچمہ (چھرا) و بارود ہمہ از خانۂ انگریز آوردہ، و باگنجینہ دار لہ روے بستیز آوردہ۔ آئین نبرد و ورزش پیکار ہمہ از انگریز آموختہ، و رخ بکینِ آموزگاراں فروختہ۔ دل ست سنگ و آہن نیست چرا نسوزد، چشم ست رخنہ و روزن نیست چوں نگرید؟ آرے ہم بداغ مرگِ فرماندہاں باید سوخت، و ہم بر ویرانی ہندوستاں باید گریست۔ شہرہاے بے شہریار، پُر از بندہ ہاے بے خداوند، چنانکہ باغ ہاے بے باغباں پُر از درختان نابرومند۔ رہزن از گیر و دار آزاد و بازارگاں از تمغا۔ خانہ ہا ویرانہ ہا و کلبہ ہا (دوکانہا) خوانِ یغما۔

از دیباچۂ ثانی درفش کاویانی

غالبِ خاکسار ہرزہ کار را از آسماں بزمیں فرستادند، و فرماں دادند کہ دریں ہنگامہ پیشۂ کشاورزی (کاشتکاری) ورزد، و ایں فرزماں (فرماں) را بازماں (توقف) نہ پسندد۔ ناگزیر می بایست (ضرور تھا) کمر بستن و زمیں خستن۔ گاو راندن و دانہ افشاندن۔ ناداں (کشاورزی نکرد بلکہ) ہوس ورزید، بغزل جاں کند۔ و ازاں گہرہا۔ کہ باخویش آوردہ بود۔ نیمہ دراں زمیں پراگندہ (گویا) از ہر دانۂ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت۔ از مرواریدے کہ در خاک نہاں کنند شنیدہ؟ کہ ریشہ سر بزند۔ کاش جو کاشتے تا سود بر داشتے۔ دانست کہ ہمہ را خاک خورد، (یعنی تلف شد ناچار) نیمۂ دیگر را پیشِ شاہانِ روزگار برد۔ دیدند و پسندیدند و نخریدند۔ شبے با یکے از راز داناں پیر و مُبشّر (پیغمبرِ سخن) رفت کہ در مبدأ فیاض بخل نیست، ابر بر باغ و راغ و سمن و دمن یکساں بارد، چرا است؟ کہ مردم چندے نادار و اندے (چندے) توانگرند۔ گفت راست گفتی۔

توقیع سرنوشت ہا یکے ست؛ (یعنی یکساں است) جدا شناس (مابہ الامتیاز) اگر ہست جز ایں
نیست کہ کار و بارِ گروہے از ہر یک بہ یک ورق، و سوز و سازِ جرگہٖ (گروہے) از ہر کس بہ یک
صفحہ نوشتہ اند۔ آناں ورق از دفتر با خویش آوردند و برات روزی از ہر در کہ مقدر بود بُردند
اینان- ازاں رو کہ انفکاکِ صفحہ از ورق صورت نہ بست۔ تہیدست آمدند، و تہی کیسہ زیستند۔
گفتم از چیست؛ کہ درجا بسوے دہر ع

بخت صلۂ مدح و قبولِ غزلم نیست

گفت آں از نیست کہ برات (چٹھی یا چیک) نیاوردۂ وایں از انست کہ سخنہاے بلند داری
و بہ ناشناسا زباں (یعنی اجنبی زباں) حرف می زنی. گفتم چہ کنم تا از اندوہ باز رہم؟ گفت شکیب
آور و خوں گری: و آنچہ از شیخ علی حزیں شنیدۂ می گوے ؎

کس زبان مرا نمے فہمد — بہ عزیزاں چہ التماس کنم

فشاں دادن اغلاط برہانِ قاطع سپاس می خواست نہ ستیز؛ در قلمرو ہند کس نماندہ باشد کہ مرا
بدیں نیکی بد نخواندہ باشد، یکے خنجر آورد کہ من قاطع قاطع برہانم؛ دیگرے اخگر آورد کہ من محرق قاطعم[۱]
کیست تا از من بداں جوانمرداں گوید کہ از دریدن و سوختنِ کاغذ جز فغان و دُخاں چہ خیزد؟
بزہ مند (گناہگار) ہستم؛ اگر در آتش فگنند و بہ تیغ دو نیم زنند بہرہ و گزند در خور ستم (یعنی لائق
ہستم) و بہرہ و سزا سزاوار +
سخندانِ راستی جوے را بایستہ آں کہ از ہر کتابِ فرہنگ عبارت جامع آں را بداں نگاہ تیز

[۱] جو کتابیں قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی ہیں اُن میں سے ایک کا نام قاطع قاطع اور ایک کا محرق قاطع رکھا گیا تھا۔

نگردد کہ از بس تیزی در جوہرِ لفظ فرو دَرروَد تا چگونگیِ پیوندِ الفاظ کہ انگیزشگاہِ معنی ست آشکار شود۔ ہرگاہ آں را بہنجارِ اہلِ زباں نہ بیند۔ داند کہ در سودائے زباندانی جز زیاں نہ بیند۔

دگراں دانند و کارآگاہاں: مرا نیز خردے و دانشے دادہ اند۔ فرازآوردۂ دیش آوردۂ اندیشۂ بیگانگاں را چوں پذیرم؟ و از نیروئے خردِ خداداد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نیروئے فرائے دانشِ من دانشمندے+ کسے ست کہ اگرچنانکہ رازداں بود۔ رازگوئے نیز بودے ششمیں ساسان* بشمار آمدے۔

ز خویشاں بہ بیگانگی شادمانم	نیم بکس چوں بکس ہے نیم (در صورت ۱۲ / در سیرت ۱۲)
غریبم ولے روشناسِ عزیزاں	چنارِ سرافراز در بوستانم
گرفتم کہ از تخمِ افراسیابم	گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائی ندارم	رہ و رسمِ کشورکشائی ندانم
بمیدانِ معنی خداوندِ رخشم	بصنعارِ پہلو زباں۔ پہلوانم
دوسی سال توقیعِ معنی نوشتم	سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطعِ برہاں۔ کہ صنعتِ نقشبندِ خیالِ من ست، نہ نامۂ اعمالِ من ست کہ دراں جہاں بمن خواہند سپرد۔ ہمدریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقامے چند کلامے چند بفزایم، وایں مجموعہ را۔ کہ قاطعِ برہاں نام نہادہ ام۔ سپس درفشِ کاویانی خطاب دہم۔

+ مراد ازاں مولانا عبدالصمد استادِ دبیر است ۱۲ * ساسان نام پسرِ بہمن بن اسفندیار بود کہ از پادشاہی سیاحت و تحصیلِ حکمت و ریاضت پرداختہ و کسے دو دیگر بر طریقۂ وے بودہ اند و ایں ہر چہار را ساسانِ اول و دوم و سوم و چہارم نامیدہ اند بعد ازیں از خسرو پرویز ساسانِ پنجم ظہور آمدہ کہ دساتیر را از لغت ... در زبانِ دری ترجمہ کردہ ۱۲

نازم بخرام کلکِ طرز رقمش — تاماست زتیزی بدم تیغ دُمش
چوں اسمِ کتاب قاطع برہاں بود — گردید درفش کاویانی عَلَمش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودنِ سخنہاے ریزہ (متفرقہ) جز افزودن ہوش انگیزہ (سبب و باعث) ندارد۔ یاراں جفا کنند، ومن بہ ازاے ہر جفا وبعوض ہر جفا، وفا ورزم۔ ہمانا نکوئی وبہی یاراں خواہم وبس۔ بند نہند، پند دہم۔ داد دریغ دارند، اندرز دریغ ندارم۔ سنگ زنند، ثمر بارم۔

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں اُن میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے۔ وہ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں، فقروں اور اُنکے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن، اور توازن اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔ اکثر جگہ صفات متوالیہ ومتتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ پس سوا اسکے کہ یہ نثریں شعر کے اوزان مخصوص سے جنکو اسکی ہیئت میں کچھ دخل نہیں۔ معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے اُن پر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے

چونکہ یہ نثریں مرزا نے خاصکر اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافت طبع کے لیے لکھی ہیں اور اُن میں اپنی نوآیین طرازی اور نادرہ سنجی کا۔ جیسا کہ چاہیے۔ حق

ادا کیا ہے اس لئے جب تک کہ انکے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے عام ناظرین
اُن سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائیگا
جسکی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گذریگا لہذا اُن نثروں میں سے صرف اس قدر
انتخاب کیا جائیگا۔ جس سے مرزا کی ان جزیل اور گرانمایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہوسکے۔
اس غرض کے لئے ہم اول بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین سے
کچھ فقرے لکھکر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس
پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب پنج آہنگ کا دوسرا آہنگ۔ جو مرزا نے
اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جسمیں اپنی طبیعت کے تقضا کے
خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں اُسکے اول
میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے سیٹھے مضمون پر کچھ
لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔
وہاں ایک جگہ مضمونِ مذکور کی نسبت لکھتے ہیں " زمینے شورکہ چون ذوق مے :
طینت زاہد۔ ہیچ گلبن را در انجا ریشہ در خاک نہ دوَد۔ و نہالے نا استوار کہ ہر دیوار کہ دراں
ریگستاں برکشند بیش از سایۂ خود بخاک افتد"
فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو۔ کہ دیوانِ مذکور اور اُسکے
نوادرِ افکار میں آورد اور تصنع یا کسی اُستاد کی بلاواسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے
اس طرح ادا کرتے ہیں " بنا میزد (یعنی چشم بد دور) نختیں نقابے ست از روے شاہد

ہر صفت کردہ معنی بجنبشِ نسیم بر افتادہ؛ یعنی تنگ کشا کشِ دست نا کشیدہ۔ باز پسیں علیست چرا
از گرمی چراغانِ نیم سوختہ بپلورخ با فروختن دادہ؛ یعنی داغِ منّتِ خس نا دیدہ۔
ایک جگہ اس مطلب کو۔ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی
قدر و قیمت پہچاننے اور اُسکے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا۔ اس طرح بیان کرتے ہیں
"سخن آفریں خدائے گیتی آرائے را ستایم کرتا نہانخانۂ ضمیرم را از فراوانیِ زنگار رنگ معنی
پر لعل و گہر انباشت، بازویم را ترازوی مرجان سنجی و خامہ ام را ہنگامۂ گہر پاشی ارزانی داشت۔
اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کرکے ہدیۂ ناظرین تاکمیں کرتے ہیں
دیوانِ فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے
بے بہرہ سمجھکر میرے حسنِ بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں۔ اسطرح بیان
کرتے ہیں "لاے خُم میخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگاں۔ سگالند کہ ہیچمدانے را ایں مایہ سیرابی
نطق از کجاست: غافل کہ نمِ رشحۂ یک فیض ست کہ سبزہ را دمیدن، و نہال را سرکشیدن
و میوہ را رسیدن، و لب را زمزمۂ آفریدن آموخت۔ و بہ پر تو مہتاب از نہ ہدایت تبکیر نگردگار
اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را این ہمہ، روشنائی گفتار چراست؟ بے خبر کہ فرّہ تابشِ یک نورست
کہ شمع را بہ شعلہ، و قدح را بہ بادہ، و گُل را بہ رنگ، و درون را بسخن بر افروخت + + + +
واغم از کوتہ نظرانِ تنگ چشم کہ دمیدن تازہ گل از گیاہ، و درخشیدنِ برق بشبہائے سبا
شگفت ندارند، و جنبیدنِ زبانہائے گویا بہ سخن ہائے نغز دشخوار انگارند۔ غنچہ مشکیں نفس ست
و بادِ غالیہ سائے۔ و گُل کشادہ روئے، و بلبل نوا سنج: زباں چہ گنہ کردہ است کہ سخن سرا

(حاشیہ: از دیباچہ دیوان فارسی)

نباشد، مہر جلوہ برتابد، و ذرّہ بیتابی، و بحر روانی، و قطرہ اشتلم، دل راکہ گفتہ است کہ از شورش ستوہ آید، ہمانا برانست ایں گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفانِ گذشتہ را تردماغ ساختہ، حالیاً بساطِ بزمِ سخن برچیدہ، و جام و سبو برسرِ ہم شکستہ، و ازاں قُلزُم قُلزُم راوق نمے برجاے نماندہ، پندارند، کاش با نجمنے - کہ من در فرودیں رَدہ (یعنی صفِ پائیں) بہ حلقۂ اوباش قَدَح می گیرم - فرارسند، تا وارسند کہ مے فراوانست، و ساقی بے دریغ بخش، پیمانہا جُرعہ ریز ست، ولبہا العطش گوے۔ وَ لِلّٰہِ دَرُّ مَنْ قال۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان ست   مے و میخانہ با مہر و نشان ست

آرے صہباے سخن بہ روزگارِ من از کُہنگی تُند و پُر زور ست، و شبِ اندیشہ را بہ قُرِ دمیدنِ سپیدۂ سحری برات فراوانیِ نُور ست۔ ہر آئینہ رفتگاں سرخوش غنودہ اند، و من خرابستم، پیشینیاں چراغاں بودہ اند، و من آفتابستم۔

اِسکے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کرکے اِس طرح لکھتے ہیں "انصاف بالاے طاعت ست - دَرہواے کہ بال بالاخوانی (یعنی خود ستائی) زدہ ام، و در آواے کہ خود را بہ تنگرفی ستودہ ام، نیمۂ ازاں شاہد بازی ست، یعنی ہوا پرستی۔ و نیمۂ دیگر توانگر ستائی یعنی بادخوانی۔ بیداد بیں کہ ہر جا بشانہ خمے از زلفِ مرغولہ مویاں کشودہ شود - بلا درمن آویزد تا دل بہ پیچاکِ آں شکن بندمے۔ و خواری نگر کہ ہر گاہ از خود غافل و از خدا فارغے براورنگِ سروری کج نشیند - ہوس مرا برانگیزد، تا بہ پیشش بندہ وار راست ایستمے۔ شادم از آزادی کہ بسیا سخن بہنجارِ عشق بازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدح

اہلِ جاہ سیاہ گرد ستم۔ دریغا کہ عمرِ سبک سیر نختے بہ جامہ و چنگ سرآمد، و پارۂ بدر رفع و دریغ رفت۔ فرجامِ گراں خوابی بر نخاست، و آشوبِ ہوسناکی فرو ننشست۔

خاتمۂ دیوانِ فارسی میں اس بات کا عذر- کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اُسکے چھپوانے کی نوبت پہونچی- اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خودسر اور بلند پرواز تھی اُسکی روک تھام میں بہت سا زمانہ گذر گیا- اور اس مطلب کو اپنے طرزِ خاص میں یوں ادا کرتے ہیں۔

"ہاں وہاں رخشے بداں توسنی کہ عنانش موے و مشامش بوے بر تافتے، و از شموسی (سرکشی) گام بہ رازی ننہادہ جز بہ پہنا نشتافتے۔ از ترسندہ دلی عنانش کشیدہ، و بہ لابہ آواز بوسہ اش آرمیدہ داشتمے۔ چوں پارۂ از راہ بدیں گونہ- کہ بر شمردم- بریدہ شد، ور و زر بلند گشت، ہم جوشِ تندیِ توسن فرو نشست، و ہم دست و پاے سوار از عناں و رکاب خستگی پذیر آمد۔ تابِ مہرِ نیم روز مغز در سرِ سوار گداخت، و تفتگیِ ریگِ بیاباں نعل در پاے نگار و نرم کرد۔ رائض را دم و گرۂ را قدم بگداز آمد۔ ہم آں بہ آخر گرائید، و ہم ایں را بہ بستر نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی توسنی سر آمد، و در ہنگام گستہ دمی خستگی روے آورد۔ ---- کیست تا از من پُرسد، و اگر نا پرسیدہ گویم در دلش فرود آید، کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا (یعنی جنگ ہا) روے دادہ، و پس از آنکہ کار بداں جا رسید کہ ہمہ گراز کوفتگی فرو مانند- بیا بخی گری توفیق بکدام قرار داد آشتی اتفاق افتادہ۔ خامہ دیر جنبید بود، و شوق زود گراے؛ (جلد باز) گفتار را از نہیبِ دورباشِ اندیشہ بہ رازنائے خاص

دل وزباں خوں شد، واگرناگہ از دل بزباں رسید۔ والا پیچیٖ ہمت آں را بخامہ نسپرد۔ ہرچند منشِ (طبیعت) کہ یزدانی سروش ست در سرآغاز نیز گزیدہ گوے و پسندیدہ جوے بود۔ اما بیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادہ روی) پے جادہ نشناساں برداشتے، و گرمیٔ رفتارِ آناں را تعرّضِ مستانہ انگاشتے۔ تا ہمدراں تگاپو پیش خراماں را بخجستگی از پس ہمقدمی (یعنی لیاقت ہمراہیٔ خویش) کہ درمن یافتند۔ مہر بجنبید، و دل از آزرم (مروّت) بہ درد آمد۔ اندوہِ آوارگیہاے من خوردند، و آموزگارانہ درمن نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندۂ زیرلبی بیراہہ رویہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہرِ نگاہِ طالبِ آملی و برقِ چشمِ عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہاے ناروا در پاے رہپاے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمیٔ گیرائیٔ نفس (تاثیرِ کلام) حرزے ببازو و توشۂ بکمر بست، و نظیری لاابالی خرام بہنجارِ خاصۂ خودم بچالش (رفتار) آورد۔"

دیوانِ تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قویٰ اور اپنے قلب ماہیت کو اِسطرح بیان کرتے ہیں۔ "ہاں اے غالبِ تیرہ روزِ دژم اختر! کہ بدیں ہستی و کسائی (شخصیت) کہ تراست۔ بداں مانی کہ وانی در عالم فرصِ محال سپندے دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ! چہ مایہ جوشِ سوداست (یعنی غلبۂ مادۂ سودا) کہ ہر نقشے کہ مے کشی۔ چوں خطّے کہ از نقطہ برآورند ہمرنگِ سویداست۔ آں تمر و اندیشہ۔ کہ از روانیِ خامہ و روانیِ گفتار آب و ہوا داشت ہاے تہش را فرو ردیں پرستار بود۔ و چاشنگمش را نسیم سحری پیشکار۔ بدیں ناخوشی و ترشی ہیولا چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ جمیدن دل از دستِ تماشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روے

داد کہ بہ دمیدنِ پردہ شکیبِ نظارگیاں نہ درد۔

آں اثرِ پردہ سازت چہ شد — زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں ز جنوں پردہ کشائیت کو — ولولۂ سلسلہ خائیت کو
آں نفسِ نالہ کمندت کجاست — واں نگہِ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جواب گفتہ) کہ سوزِ غم دود از دل برآورد، وگدازِ نفس آذر در زباں زد۔ بالے کہ ہر آئینہ نگداخت، و باز بانے کہ ہمانا نسوخت، عذرِ غمزدگی مسموع نیست۔ بیا تا ہمیں دلِ بہ زہرۂ الحذر نواے راسخن نہیم؛ وہمیں زبانِ کژ نغمہ ایں المفر سراے را بگفتار آریم (یعنی طوعاً وکرہاً تقریظِ دیوانِ تفتہ بنگاریم)

زمن جوے در بدنکو زیستن — جگر خوردن و تازہ رو زیستن
سمن چیدن و دررہ انداختن — دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بہ ہمگناں اظہارِ خوشحالی می کنم و اندوہ درونی را کہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم تا بر ہیچکس ظاہر نشود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں — بہ شورابہ شستن ز رخسارہ خوں
شگفتن ز داغے کہ بر دل بود — نہفتن شرارے کہ در دل بود

ستایشِ سخن چشم بد دور۔ خمکدۂ سخن را شرابے ست پُر زور کہ زمیں ازاں بہ لاۓ (یعنی بدر روے) و سپہر ازاں بوۓ آنچناں برقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و شتہ را عمامہ از فرق فرو دافتد شگفت نماید۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثرِ فارسی کا سب سے بڑا حصّہ اُنکے مکاتبات و مراسلات ہیں جنمیں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں اسی لئے ہم اس حصّے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کرینگے اور جہاں تک ہو سکیگا مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائیگا۔ اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اُنکو بھی چھوڑ دیا جائیگا۔

مرزا علی بخش خاں فیروزپور جھرکے میں ہیں، نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا ہی اور اُنکی جگہ شمس الدین خاں مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتے پہنچکر خط لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں۔

"میر فضل مولےٰ خاں نام یارے داشتم، اورا ناگرفت ذناگاہ) درعرضِ راہ بہ مرشدآباد یافتم در نوردِ گفتگوہائے و پرس وجوہائے کہ رفت - از جامہ گذاشتن (یعنی از مردن) فخر الدولہ بہادر بمن خبر داد؛ و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں بر گفتند۔ آوخ! کہ چراغِ روشنِ این دُوداں مُرد، و شبستانِ آرزوہا تیرہ و تار شد۔ از جانبِ شما اندیشناکم، و دانم کہ آنچہ شمارا پیش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں را روز بازار خواہد بود، و فرومایگاں را گرمی ہنگامہ۔ زود اکہ انجمن از ہم پاشد، و پراگندہ ہیچند گرد آیند۔ دولت روے گرداند، و آسودگی برخیزد۔ زینہار ہوشمندی را کار باید بست، و ہموارہ بخود نگراں باید بود"

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اسطرح شروع کرتے ہیں "جانِ برادر!

سخن را از فراوانی بر روے ہم افتادن ست، و گرہ در گرہ گردیدن۔ و من آں می خواہم کہ
اندک گویم، و سود بسیار دہد، و شنوندہ آں راز و د دریابد۔ و ایں ناسپنج (قصہ) روائی پذیر نیست
مگر آنکہ گویندہ دراں کوشد کہ نشستن از گفتن آں مایہ سو تر منزد و کہ سرِ ایں ہر دو رشتہ با ہمدگر
نتواں یافت، و نقش یکے در آئینہ دیگرے نتواں یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرا رسید
کہ چہ می گویم، و ازیں گفتن چہ می خواہم، و شمارا در برابر آں چہ می باید کرد۔ و اندازہ آں بایست
تا کجاست،، اسکے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کئے ہیں۔

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسہ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں اور انھوں نے
بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہونچنے کی شکایت کی ہے انکے خط کا جواب
اس طرح لکھتے ہیں۔

امروز شرارۂ بداغم زدہ اند	نشتر برگ صبر و قرارغم زدہ اند
از کثرت شور عطسہ مغزم ریش ست	تا عطر چہ فتنہ بر دماغم زدہ اند

جنبش خامۂ عیسوی ہنگامہ مطاع مکرم مخدوم اعظم را نازم کہ باحیاے ہوسہا سے مُردہ
ساحت خاطر را عرصۂ محشر ساخت، و بازار رستخیز گرم کرد۔ خار خار دیریں آرزو یا سراز
دل بر آورد، بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی وطنے، و از مہربانان انجمنے بودہ است۔ چوں نشتر پرسش
بمغز اندیشہ فرو بردہ اند (یعنی احوال پرسیدہ اند) خونچکانی نواہا تماشا کردنی ست۔ درازی
زمان فراق۔ بگمان مخدوم شانزدہ سال ست و بدانست نامہ نگار کم از بست سال نیست
ستم ظریف کہ گلے بودہ است کہ نقش آسایش از صفحۂ خاطر بداں ستردہ اند۔ آغاز ورود بہ دہلی

کہ دُردِ بادۂ غفلتے بہ قدح داشتم (یعنی تقیہ- ہوا و ہوس در سر بود) لختے از عمر بہ پیمودنِ جادۂ کامرانی و ہوس گذشت، و بے راہہ خرامیدہ شد- تا سر از مستی بگردید (یعنی بدمستی سے سر پھر گیا) و اندراں بیخودی پائے مصطبہ پایہ بگوے فرورفت (گڑھے میں اتر گیا یعنی ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے) لاجرم درہم شکستہ سراپاے، و گرد اندوہ سر و روے، برخاستم۔ ہنگامۂ دیوانگیِ برادر یک طرف، و غوغاے وام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب، و نگاہ روزنۂ چشم، فراموش کرد، و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ بالبے از سخن دوختہ، و چشمے از خویش فروبستہ- جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خستگی، با خود گرفتم۔ و از بیدادِ روزگار نالاں، و سینہ بردمِ تیغ ملال، بکلکتہ رسیدم۔ فرماندہاں سترگی و کوچک دلی (یعنی مہربانی و شفقت) کردند، و دل را نیرو بخشیدند۔ آں ہمہ بخشایش- کہ مشاہدہ رفت- امیدِ کشایش آورد، و ذوق آوارگی و ہواے بیاباں مرگی- کہ مرا ز دہلی پدید آوردہ بود- بدل نماند۔ و ہوس آتشکدہ ہاے یزد و میخانہ ہاے شیراز- کہ دل را بسوے خود می کشید و مرا بہ پارس می خواند- از ضمیر بدر جست۔ (یعنی بمشاہدہ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) دو سال دراں بقعہ نجاو بودم، چوں گورنر جنرل آہنگِ ہندوستان کرد پیشا پیش دویدم و بدہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، و کار ساختہ شدہ- صورتِ تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیر سال ست کہ خانماں بباد دادہ، و دل بہ مرگِ ناگاہ نہادہ، بکنجے نشستہ ام؛ و در آمیزش برا بیگانہ و آشنا بستہ،،

"من اگر با اینہمہ رنج و اندوہ- کہ پارۂ ازاں باز گفتم- در نگارشِ نامہ و سپارشِ پیام کاہل قلم

...دم باشم، و بزرگانِ وطن را بیاد نیارم، در عالمِ انصاف بزہ مندنیستم۔ آما گر ازمایگانِ ...الب مہر و وفا۔ کہ از دُور افتادگاں نپرسند و از مرگ و حیاتِ دوستاں باز نجویند۔ اگر گفتگو میاں ...یہ، و ہمندِ شکوہ عناں بر عناں (یعنی بمقابلۂ یکدگر) تا زدگوے دعوی چگونہ خواہند بُرد، و ...لع نظر از حریفِ آب و نداں (یعنی حریفِ مغلوب) کہ مَنَم۔ خدا ے تو ما را چہ جواب خواہند داد"

"کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست   مرا در دہر پنداری وطن نیست"

مولوی نور الحسن نامے ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اُسکے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔ اُسکے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں۔ " پدید آمد کہ خاطرِ عاطر را بجانبِ نثر گرایشے، و ہنگامۂ ایں ...فتار (یعنی نثر نگاری) را در انجا (در کلکتہ) آرایشے ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے ...ادہ آید، و ہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید۔ و م سردیِ شما (یعنی کم شوقیِ شما) ...ہ دانش آموزی۔ انچہ دیروز (یعنی در زمانۂ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام۔ یاد میکنم، و خوں گرمیِ شما (یعنی سرگرمیِ شما) در خرد اندوزی۔ آنچہ امروز مے نگرم خود را بدیں شادی کنم۔ ہمانا در اندیشہ ...الے برگذر دارم بداں زودی۔ کہ ثمر از شاخ افتد۔ نخلے شدہ، و رُطب بار آوردہ، سنے ...ہنگامہ یوسفے در نظر دارم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رباید۔ از بندِ حجاب بدر آمدہ، و ہر ہفت ...ردہ۔ خواستہ آید کہ مسودۂ نثر و سہرا بمن فرستید، و من آں را نگریستہ، و نشستِ ہر کرشمہ وانگیز ...بزلہ را بایستگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحب من! اگر دانستہ اید کہ گفتار جز بگفتار سو نگردد، و سخن جز بہ سخن ...شناختہ نشود، ہر چند ارادتِ شما ذریعۂ سعادتِ من و خرسندیِ شما موجب رضامندیِ من ست لیکن

تحریر درمیان نہ گنجد، و بیانجی گری خامہ کار برنیاید۔ آرے نگارش یکدست است و گفتار لخت لخت۔ ستردن یک لفظ از میانہ، و آوردن لفظ دیگر بجاے آن بر نشانہ۔ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس و جو دارد۔ و حق ایں پرسش نتواں گزارد۔ مگر بہمزبانی۔ دریں نزدیکی یکے از برادراں۔ کہ در برادراں ازوے عزیزترے نیست۔ سخن ہاے پراگندہ مرا کہ عبارت از نثر ست۔ گرد آوردہ، و صورت سفینہ دادہ است۔ نیز پس آں مجموعہ پریشانی را پیش شماے فرستم، تا دستمایہ سگالش در سخن و باز نمائندۂ اندازہ نکوئی فن تواند بود + + + + +

نواب مصطفٰے خاں مرحوم نے۔ جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے۔ مرزا کو خط لکھا ہے اور اسمیں انکی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے؛ اپنے نتائج افکار میں سے کچھ انکو بھیجا ہے اور ان سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے۔ مرزا نے اسکے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اسمیں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں۔

"تا دکانم در کشادہ بود، و رنگ رنگ متاعِ سخن بروے ہم نہادہ؛ کس از مشتریاں حلقہ بر در نزد، و سوداے خریداری از ہیچ دل سر برنزد۔ چوں دکاں را کالا، و زباں را حرفہاے جگر آلا (یعنی آلودہ بخونِ جگر) نماند۔ روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفٰے خاں) پدید آورد کہ نقدِ رائج سخن خود را بہاے گفتارِ نارسا من می دہد؛ و گوہر را بہ پلۂ بیہائگی خزف می نہد۔ + + + ہاں وہاں اے خریدار دکانِ بے رونق! از فراوانی مسرت ورود مسعودِ ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا۔ با آنکہ نکوئی خواہ خویشم۔ بر من برشک آورد۔ حوصلہ مرا۔ کہ فرسودۂ غمہاے دہرم۔ گنجائی ایں مایہ شادی کو؟ و اندیشہ مرا۔ کہ دل شکستۂ دورباش یارانم۔

... پیدائی ... کجا ؟ روزگار را انہ آزارِ خویش چگونہ پشیماں گیرمے کہ اینچنیں ... را ... پذیرمے۔ و دوستاں را آنگاہ قدر ناشناس پندارمے کہ از شما اینقدر ستائش دربارۂ خویش باور دارمے۔ حقا کہ نہ آساں ست ستودہ شدن بہ زبانِ شیوا بیاناں (یعنی مفتیام) و دشوار تر از انست اندازہ نمائی باندازہ داناں"

"قبلۂ من چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بر فرقِ فرقداں سائے افشاندم (یعنی مجموعہ نظم فارسی) اکنوں آہم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست۔ گوئی پس از سنجتنِ آں گنج گنجداں گرفتہ، و از سخن ہر چہ از ل آرزدِ من بود گفتہ شد۔ + + + + + + + + + + + + +

نواب مصطفٰے خاں مرحوم نے تذکرۂ گلشن بے خار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لئے بھیجا ہے اُسکو دیکھکر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے "من کہ زبانم در ستایش بیقرار ست و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ۔ امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نشوم، و بریں مایہ جرأت بزہ مند نگردم۔ بنامیزد (چشمِ بد دور) تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم آمدہ کہ پیش طاقِ بلندنامی را نقش و نگار ست، و نہالِ نکوسرانجامی را برگ و بار۔ رہرو نظر چوں بہ بیدا ے کنار ناپیدا ے ذوقِ سخن گام تماشا بردارد توشہ بہ ازیں بر کمر نتواند بست۔ خضر (مرصوف) با آں ہمہ جگر خستگی کہ سکندر داشت لبش بر شحۂ آبے تر نتوانست کرد، و آں آب از دریا بخشیدن بود۔ شما گروہے را از دو رو نزدیک بہ سخن زندگانیِ جاوید بخشیدید، و ایں لختے از عمرِ بکار دیگراں کردن ست۔ جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ و ہمگناں را بہ نکوئی نام بر آمد۔ بارے گزرۂ سفتنِ خامہ و گوہرِ نگشتن نامہ در ردیفِ الف بہ نگارشِ اشعار پردین شار

حضرت آرزدہ† از چہ روست ؟ ہر چند ذکر قدامِ بچنیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوارِ شانِ فضیلت باشد لیکن اگر بمقتضائے فرطِ محبت جرأتے بکار میرفت گناہے نبود؛ و در تلافیِ آں بہ پوزشِ نیاز بے پچیدہ حاجت افتاد،،

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جب کہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیجدیجیے اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"دردمند نوازا! نسیم درود شکیبی رقم نامۂ غنچہ ایں راز را پردہ کشائے، و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد۔ کہ روزگار ہرگز کلکِ مد طولِ زمانِ فراق نقشِ بے اعتباری ہائے من از صفحۂ خاطرِ احباب نستردہ و ترکتاز صرصرِ بیدادِ جدائی خاکسار ہبائے مرا از یادِ عزیزاں نبردہ"

"در معرضِ طلب نثر فرو ماندہ تر از اں میزبانِ بے دستگاہم کہ ناگرفت (اچانک) مہمانے عزیزش از راہِ دور در رسد، و بیچارہ با گردِ سراپائے سرمایۂ خویشتن بگردد۔ تا شوربائے دود بختے و نانِ کشکینے (یعنی نانِ جویں) فراز آرد۔ من و ایمانِ من کہ بگردآوردنِ نثرِ پراگندہ نپرداختہ و خود را دریں کشاکش نینداختہ ام۔ چہ پیداست کہ فرو ریختۂ کلکِ ایں کس (یعنی من) نقشے ست نژند، (یعنی زشت) یا رسمے ست فرہمند، (یعنی خوب) در صورتِ اول چہ لازم ست خود را بہیچ فروختن، و وبالِ نظارۂ آیندگاں بہ سَلَم خریدن؛ و در شقِ ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگاں چہ بردہ اند و گذشتگاں چہ یافتہ کہ مارا آرزوے آں واپہ (یعنی دریوزہ) بتیاب دارد۔

---

† اوّل مسودے میں مفتی صدر الدین خاں مرحوم متخلص بہ آزردہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر مرزا نے جب یہ خط لکھا تو نواب صاحب نے اُن کا بھی تذکرہ درج کر دیا۔

...از ...اعت است۔ بدعوی گاہے کہ توانائیِ قتیل را بفروہیدگیِ فرہنگ ...ہیدگیِ روش) مُسلّم داشتہ، ولوائے نورالعین واقف پیشوائیِ شیوہ (یعنی بجوئیِ رو) برافراشتہ باشند۔ باکہ باید گفت کہ نتائجِ طبعِ ماکجائی ست، وماراچہ لذت دریں جگرخائی ست سطرے چند کہ دیباچگیِ دیوانِ ریختہ کسوتِ حرف ورقم پوشیدہ، ودودِ سودائے کہ آرائش سفینۂ موسوم بہ گُلِ رعنا ازسویدا جوشیدہ است ارمغاں می فرستم وازشرمِ تنک مائگی آبِ گردیم والسلام

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسی جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں " دریں ہنگام۔ کہ فرماندگی ازاندازہ گذشتہ ودل بافسردگی خوے گرفتہ است۔ ندانم چہ مے نگارم وچہ می نگرم کہ دریں نگرستن نگہ ازنازبدیدہ درمی گنجد، ودریں نگارش خامہ ازشادی دربناں (سرِ انگشت) مے رقصد بخت رابرسائی ستایم وپندارم کہ بطورِمعنی رسیدہ ام۔ خودرابگرانمائی آفریں گویم وانگارم کہ موسے را بایدِ بیضا دیدہ ام۔ اگرمخدومِ مرا بگرفتنِ عیارایں دعوی حیرتے روے دہد، وایں مایہ بالاخوانی وخودنمائی ازمن عجب آید۔ گویم ہاں انصاف، سخن بہ کنایہ می سرایم نہ بگزاف۔ موسی اشارہ بہ سیدی مکرمی میر موسی جان ست ویدِبیضا عبارت ازدیوانِ فروغانی عنواں۔

زہے دیواں کہ مدادش ازدودۂ چراغ طورست۔ وغلافش ازدیباے حُلۂ حور۔ قلزمِ معنی راسفینہ است، وجواہرِ مضموں راگنجینہ۔ + + + + سبحان اللہ سخن بہ روزگارِ مخدوم بپایۂ بلند رسید، وارُدو را رونقِ دیگر پدید آمد۔ اینکہ نارسیدنِ نامۂ من بخاطرِ عاطر جاے گرفت، وشکوہ آں بزبانِ قلم رفت۔ مرا آبرو افزود، وازرشِ مرا درنظرم جلوہ گر ساخت۔ خوشا من کہ دراں

چشم و دلم جاے باشد، وچوں نامۂ من نرسد بہ آرزو دارزو۔ گردِ سرِ ایں نوازش گردم، و بریں پرسش جاں برافشانم ۔ + + + + + + + +

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعۂ خط موسومۂ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی ہے اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں۔

"قبلہ وکعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال را ہواے دیدنِ عقیدت در سر، وناگاہ شامگاہے بہ نشیمنِ تنہائی من گذر، افتادے۔ آں درگرفتنِ آتش گرداگردِ والا کاشانہ، وسوختنِ خانہ ورختِ ہمسایگاں از ہر کرانہ، ونرسیدنِ آسیبے بلازماں دراں میانہ، از کجا شنودمے؛ واگر نشنودمے ہر آئینہ ہم حقِ دوستانہ پرسش۔ کہ شیوۂ غمخواری واندوہ ربائی ست۔ ناگزاردہ ماندے، وہم ایزدی نیایش کہ لازمۂ حق شناسی وسپاس گزاری ست تبقدیم نرسیدے۔ ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لالہ ہیرالال) کامیاب پیام ونامہ، وآشنایانِ جگر تشنۂ رشحۂ خامہ!!

واے بر من کہ رقیب از تو بمن بنماید | نامۂ واشدۂ مُہر بہ عنواں زدۂ

"ہمانا آں سوزندہ آذر سرگرمیِ شوق از من فرا گرفتہ بود کہ بیتابانہ گردِ سر گردید، واندراں اشتلم (شدت) زبانہ وشرارہ در خویشتن نگہداشت۔ ہیہات من کجا وایں ہمہ دعویِ بلند از کجا!! خود نمائیہاے گمانِ تاثیرِ مہر و وفاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاے و یافہ سراے وارد؛ ورنہ آں را کہ از شعلۂ آہِ جگر سوختگاں دامن نسوزد، عجب نیست اگر آتشِ افروختہ پیراہن نسوزد۔ شکوہ پیشکش، وپیغارہ (طعنہ) برطرف؛ خداے توانا را شکر گویم کہ بلاے بی زینہار

برطرف

[illegible] خویش بگزاشتند، وتابِ [illegible] بحران را دیده ودیده وراں را سُرمہ بدست افتادہ کرشمۂ
[illegible] جبرئیل ومعجزۂ آسودگئ خلیل را در نظرہا تازہ کرد + + + اگر دانستمے کہ مشیّتِ دُختر ساری
فراہم کشید، ومرا اندریں مُحال طلبی بر من زبان طعنہ دراز نخواہد شد۔ ازاں مخدوم بے عنایت
پاسخِ ایں نامہ وتفصیلِ ایں ہنگامہ درخواستمے وپرسیدمے کہ دراں ہنگام کہ آتش زبانہ زد،
ونگہ بسراغِ تیرگیِ دودوے وتابشِ شعلہ نوے فرارسید۔ شما چہ می کردید؟ ونورِ چشم مردمی وفرزانگی
مولوی عبدالحق کجا بود؟ وپس ازانکہ رستخیز درہمسایہ آشکار شد، وہنگامۂ شور وانجمن افتاد، سراسیمگی
درونی پرستاراں وبیتابی برونی ہواداراں چہ قیامت آورد؟ وانیہمہ آشوب چہ مایہ دیر کشید؟
وفرجامِ کار۔ کہ فردۂ امنی دادند۔ برکارخانۂ دواب وُبُنگاہ وبار کناراں (یعنی اسباب ایشاں)
کہ اینہا را جز باطرافِ کاشانہ محل نیست، وبیشتر ازینہا طعمۂ آتش بلکہ افروزینہ (ایندھن)
آتش ست۔ چہ گذشت؟ لیکن۔ چوں ارزشِ التفات از من سلب کردہ، ومرا نیک در دل
فرود آوردہ اند کہ حالیا دراں گوشۂ خاطرم جاے نماندہ۔ ہرچہ گفتہ ام بطریقِ آرزوست نہ بسبیلِ
سوال۔ والسلام

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوقِ ملاقات اور غزلِ تازہ کی خواہش
ظاہر کی ہے اُسکے اوّل اور آخر کے فقرے یہ ہیں "سحرگاہے کہ دلم از دردِ شانہ۔ چنانکہ مومن†
مہرمیشہ از رنج ہمسایہ درآزار باشد۔ بیقرار بود، ودستم از آستلم بیتابئ دل رعشہ دار، فرخندہ سروشے
از در در آمد، وسیر دنِ بہار ساماں نامہ گل بہ جیبِ تمنا ریخت۔ ہرچند نامہ سپارسِ امید زکیمیا،

† دل کو مومن سے اور شانہ کو ہمسایہ سے تشبیہ دی ہے۔

و دیدهٔ جاں را توتیا آورد، و تارک اقبال را افسر، و پیکرِ آرزو را زیور بخشید؛ لیکن انا بجنا که
اں قدسی مفاوضه از شعر و غزل - چوں نامهٔ اعمالِ زاہد از ذکرِ مَے و شاہد - ساده بود؛ دل سوخته
بداں نیا سود، و خمارم بداں نکید و جرعهٔ صہبا نشکست بگفتم بَہ بَہ ہَے! نه قروهٔ دیدارے که دل بشاہدِ
ں تواں بستن، و نه کرشمهٔ غزلے که لب بزمزمهٔ آں تواں کشودن . + + + + + + + + + امید که
ازیں بعد زود نه دیر بافشاے غزل شادم فرمایند، و نوید رو بکوتاہی نهادنِ روزِ فراق که
اندریں موسم که خسروِ انجم به اَسد[†] جاے دارد عجب نیست - بفرستند. دولت و اقبال روزافزوں باد.

جوابِ نامهٔ شیخ امیر الله سرور تخلص " رسیدنِ دلنواز نامه دل را آنومند و نہالِ
آرزو را برومند ساخت. گله از نارسیدنِ پاسخ نامه ہاے خویش مے کنید؛ و از خدا
شرم ندارید. من خود از جانبِ شما نگرانی داشتم که کجائید؟ و چه در سر دارید؟ بارے پرده
از روے کارِ شما برگرفتم؛ و دانستم که یک چند مرا فراموش کرده بودید؛ ناگاه ورودِ جناب
مولانا تراب علی بداں بقعه افتاد؛ شنیدید که فلانی (یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زنده است؛
مہرِ کہن بجنبید؛ خواستید که بنامه یاد آورید؛ از فراموشیِ روزگارِ گذشته اندیشه کردید؛ لاجرم
دروغے چند برہم بافتید، و آں را دیباچهٔ نامه ساختید. از حالِ من پرسیده اید، چه گویم که گفتن نیرزد، چنانکه گفته ام

شکسته دل تر ازاں ساغرِ بلوریم
که در میانهٔ خارا کنی ز دور رہا

خیره سرے، و آشفته راے، نه زباں سخن سراے، و نه دل از سراسیمگی برجاے.

---

† یه خط مرزا نے اس وقت لکھا ہے جب آفتاب برجِ اسد میں تھا چونکہ اسد مرزا کا تخلص اور انکے نام کا جزو ہے اس لیے آفتاب کے
برجِ اسد میں ہونے سے یه شگون لیا ہے کہ ایسے وقت میں آپ کا مجھسے ملنا کچھ دور نہیں ہے ۔

[illegible] ندرد کہ مقدمۂ من باجلاسِ کونسل درپیش ست، ودلم از تفرقۂ بیم وامید
[illegible] ے کہ قطعِ خصومت تواند کرد ننہادہ، وہنگام بہ پایاں رسیدنِ تیرہ شبِ ناامیدی
[illegible] ود ننہادہ۔ حالیا براں سرم کہ چوں جزوِ اعظمِ کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ بہادر
بدیں دیار در آید بدامنش درآویزم، وداد خواہم، واستدعاے صدورِ حکمِ اخیر کنم۔ گردہاے
برآنند کہ نواب عالی جناب بدہلی نخواہد آمد، وہم ازاں رہگذرہا باجمیر خواہد رفت۔ اگر
ہمچنیں ست بدا من وروزگارِ من، وآوخ از دوریِ راہ ودرازیِ کارِ من۔
خواستہ اید کہ نتائجِ طبعِ والاے شما بنگرم وازتراویدہ ہاے کام وزبانِ خود شما ارمغانے
فرستم۔ فرصتِ آں کجا؟ ودماغِ ایں کو؟ آمد آمدِ نواب گورنر، ودریوزۂ اخبار از ہر در، ترتیبِ
افرادِ مقدمہ، وتمہید نگارشِ حال، سنجیدنِ اندیشہ ہاے رنگارنگ، وسگالیدنِ اندازۂ
بیاں۔ آں مایہ دستیاری وغمخواری از کسے چشم ندارم کہ چوں ورقے انشا کردہ باشم نقلِ آں
تواند برداشت، باچوں دفترے از بہرِ نگریستن پریشاں کنم آں اوراقِ پراگندہ را فراہم
تواند کرد۔ بہر رنگ چندروز دگر معاف دارید، وتا زمانیکہ بمن پیوندید گاہ گاہ بہ نامہ
زنگ زداے آئینہ وداد باشید + + + + +

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے
نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں انکو نواب امین الدین احمد خاں مرحوم کے باب
میں جبکہ وہ رئیسِ فیروزپور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے کلکتے گئے
ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں "مخدومِ غالب! اگر نہ اندوہ سترگ بند بردلم ننہادہ بودے۔ من

دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد ۔۔ در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردمے۔ صرفۂ شما (یعنی سود شما) و رناکامیِ من ست (جسکے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنہ اگر تابِ توان داشتمے آں قدر با شما درآویختمے کہ شما را دامن و گریباں بزباں رفتے، و مرا سر در و شکستے۔ آخر از خدا بترسید، و از روے داد بسنجید کہ کارِ من و شما بداں رسد کہ روزہا بگذرد و بنامہ یاد نہ گردم۔ گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بندِ گزارشِ اندوہے تازہ ام شکوہ کجا بخاطرِ ناشاد مے رسد۔ اگرچہ اندریں ورق گنجائیِ ایں دو سطر نیز نبود لیکن اندیشہ براں بسنجید کہ مبادا دوستِ او ناشناسِ من مرا از خود خرسند داند، و بدیں گماں از تلافی فارغ باشد و من زیاں زدۂ جاوید و گستہ امید باشم۔

بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعاے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابنِ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ را ہماں موجِ بلا کہ زورقم شکستہ بود (یعنی تعدی رئیس فیروز پور) خانہ بسیلابِ فنا داد۔ خونِ و فایم بگردن کہ دریں سفر از ہمراہیش باز ماندم۔ واماندگی و بیچارگی من از ینجا تواں سنجید کہ دنداں بر جگر نہم، و امین الدین احمد خاں را در سفر تنہا گذارم۔ اگر قاضیِ محبت بدیں جرم بر نطعم نشاند، و بہ تیغِ بے دریغ خونم ریزد، سزاوارم۔ و لطف دریں ست کہ ہر چند در پنجاب بگفتار گرایم، و ہنگامۂ پورش آرایم شرمساری بیشتر گردد، و خجلت افزاید۔ مگر سراج الدین احمد بہ تلافی برخیزد تا از گرانیِ تشویر (شرمندگی) سبکدوش گردم، و گردِ خجلت از چہرہ برافشانم۔ یعنی کمر بہ غمخواری و رہرو نوازی استوار

... مند و او را دوست دیرینۂ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و نگارش گری بجا آرد کہ ایں درد مند دور از خانماں (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ روسیاہ را فراموش نشد، و شما را بجاے او داند۔ و نیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد و شما را دریابد۔ داند کہ اسد اللہ پیش از و بہ کلکتہ رسیدہ است۔ قطع نظر ازیں مدارج کہ برشمردم۔ آخر خدائے ہست و دادے ہست۔ افسانہ ناکامی و ستم کشی ایں فروغ ناصیۂ سعادت یعنی امین الدین احمد خاں خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند،،

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں "گوہر آگیں نامہ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید، دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید۔ نارسیدنِ نامہ مرا بافسردگی شوقم حمل کردید، چرا بہ مرگِ من حمل نکردید؟ تا از اداشناسی ہائے شما خرسند بودمے، و شما را اہلِ دل و دانشور شمردمے۔ من و ایمانِ من کہ رشتۂ مہرِ شما بہ مغز دل و دیدہ، و محبت شما با جاں درآمیختہ تا زندہ ام، بندہ ام، وفا آئینِ من ست، و مودت دینِ من ست۔ اگر در نگارش نامہ درنگے روے دہد بر فراموشی محمول نشود۔ دردہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سوداہا در سر، چہ گویم چہ می کنم، و روز و شب چگونہ بسر می برم"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اسٹرلنگ صاحب فارن سکرٹری گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں "عمرِ من و جانِ من! پس از رسیدنِ گرامی نامہ دربندِ آں بودم کہ پاسخ گزار شوم و ماجراے خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ دوشنبہ یا نزدہم ذی الحجہ بود آوازہ درافتاد کہ مجموعۂ مکارمِ اخلاق را شیرازۂ وجود

از ہم گسیخت ؛ شمعِ ایوانِ سروری مُرد، و نہالِ باغِ آگہی را برگ و بار فرو ریخت . دستگیر و یاور
را دست از کار رفت، و گرہ کشائے بستہ کاراں را نئے بناخن شکست . خالکم بدہن چگونہ
گویم ؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ نمیداند ؟ کہ مستر اندر وا سترلنگ مُرد، و از گیتی جز نامِ نیک
با خود نبرد . کاش بروئے گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) بروزنۂ گوشم ریختندے تا نشنودمے
کہ چہ شد . اکنوں امید غمخواری از کہ باید م داشت ؟ و دل را بخیالِ گردش چشم کہ تسکین داد .
رپوٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر در خصوصِ دادخواہی من بہ صدر فرستادہ است .
چگویم کہ چہ مایہ امید کاہ و اندوہ فزاے بودہ است تکیہ بر کار سازیِ آں چابک خرام
بیداے فنا (یعنی استرلنگ) داشتم اکنوں از شش سو فلک بکامِ دشمن ست . زنہار در
پاسخِ ایں نامہ درنگ روا مدارید ؛ و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ روے داد، و آں گلبنِ
روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند ؛ و پس از وے سر انجامِ دفتر کدہ چہ شد و جایش کہ
گرفت . اللہ بس ما سوی ہوس .

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ
کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں " والا نامہ رسید، و نوید فراقِ دائمی مرزا احمد رسانید .
چہ مایہ سنگیں دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیتِ دوست انشا می کنم و اجزاے وجودم
از ہم نمی ریزد . می گفت کہ بدہلی می آیم ؛ وعدہ فراموشِ بے مروت راہ گرداندہ، و ناقہ
بسر منزلِ دیگر راند . گرفتم کہ خاطرِ دوستاں عزیز نداشت چرا بحالِ خرد سالانِ خود
نپرداخت، و سایہ از سرِ شاں باز گرفت . واے بے یاریِ یاراں وے، و دریغا

پدری پسرانِ وے۔ ہر چند از مرگ نتواں نالید، و گسستن تار و پود پندار ہستی چارہ نتواں کرد۔ لیکن انصاف بالاے طاعت ست۔ ہنوز ہنگام مردنِ مرزا احمد نبود، ماں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدے، و روے نظارہ فروزش دگربارہ دیدے۔ چراں ما بہ رنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، و کارہا باندازۂ دانشِ وے رواں گشتے، حیف کہ ہمیں پسرش خرد سال ست، و باشد کہ بہ حقیقت سرمایۂ پدر دانا، و بگرد آوردنِ زرہاے پراگندہ توانا، نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ چنگ آرد بباد دہد، و بر فرودستانِ خود ستم کند، و کہیں برادراں را ناکام گزارد۔ ہر آئینہ دریں حال اینے باید ہوشمند و حق شناس کہ گرد چارہ برآید، و غمخواریِ بے پدر ماندگاں نماید۔ بلّہ درّ من قال ؎

مرا باشد از درد طفلاں خبر — کہ در طفلی از سر برفتم پدر

واللہ کہ تیمارِ آں بیچارگاں عینِ فرض و فرض عین ست ہم بر شما و ہم بر مرزا ابو القاسم خاں۔ بیکسیِ ایں جماعہ در نظر باید داشت و غافل نباید بود۔ اِن اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اِس طرح کرتے ہیں

"زینہار صد زینہار اے مولوی سراج الدیں! بترس از خداے جہاں آفریں۔ کہ چوں قیامت قائم گردد، و آفریدگار بنشیند، من گریاں و موئیہ کناں دراں ہنگامہ آیم، و در تو آویزم، و گویم کہ ایں آنکس ست کہ یک عمر مرا بمحبت فریفت، و دلم برد، و چوں من از سادگی بر وفا تکیہ کردم، و ایں را از دوستاں برگزیدم۔ نقش کج باخت، و بمن بیوفائی کرد۔ خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ واے بر من کہ روزگارہا

گذرد و خبر نداشته باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداش وفاست بسم اللہ ہر قدر توانی بفزاے۔ کہ اینجا مہر و وفا فراوان ست؛ لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد۔ و اگر خود ایں تغافل بہ باد افراہ (یعنی بپاداش) جرمے دیگرست بخست گناہم را خاطر نشان باید کرد، وانگاہ انتقام باید کشید تا شکوہ در میاں نہ گنجد، و مرا زہرۂ گفتار نباشد۔ ستم کہ معاشِ من انگونہ گوں بخ و رنگ رنگ عذاب بہ معادِ کفار ماند؛ خوں در جگر، و آتش در دل، و خار در پیراہن، و خاک بر سر، ہیچ کافر بدیں روز گرفتار مباد، و ہیچ دشمن ایں خواری مبیناد۔ راست بہ تنہا روی مانم کہ در صحرا پایش بہ گل فرو رود؛ و ہر چند خواہد کہ بالاجہد نتواند و فرو دتر رود۔ والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر کہ گیتی را بر دیش دیدمے، و وصالش را زندگی دانستمے، بہ کلکتہ رہگرا شد۔ و بگر زندگی از بہر کہ خواہم و دل را بدیدارِ کہ شادماں دارم۔ واماندگی من از ینجا تواں سنجید کہ نتوانستم ہمپایش کردن، و رو وا داشتم او را تنہا گذاشتن +

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمہ کے بگڑ جانیکا حال اسطرح لکھتے ہیں

"کارِ من بہ داد گاہِ دہلی۔ چنانکہ دانستہ باشید۔ تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد باز بداں دَر (یعنی در سپریم گورنمنٹ) رسم، و درد دل بداں رمزمہ فرو ریزم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را بر خود بگریانم۔ ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفریق۔ از روے دفتر سرکار ثابت شدہ بودے بایستے کہ صاحبانِ صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش؛ آنچہ تو بازیافت و انمودۂ یافتی ازاں افزوں تر

ت، و قرار و اد نیز جاں ست۔ لاجرم دیوانہ بودے اگر دریں کشور با نامدے، و با
قبیلہ دینی با جمعے کثیر کہ خویشاں و برادران من اند۔ بہ ستیزہ برخاستے۔ و بہ
ل ستیزی نام بر آوردمے + + + + + + +
چکنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت۔ خدارا بنگر، و بہ دردِ دل من وارس۔ کولبرک
سط کرنیل ہنری املاک بر من مہرباں شود، و رپوٹے کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید
بصدر فرستد، و جوابے کہ سودمند تر ازاں نتواں سنجید۔ از صدر حاصل نماید، ہنوز
ں جواب در راہ باشد کہ کولبرک معزول گردد۔ و ہاکنس کہ بجاے کولبرک نشیند۔
نچہ برہم زدن ہنگامۂ سلطنتے رابس باشد۔ از بہر من بصدر نویسد، و من دراں داوری
معاملہ از مستر استرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم، ہنوز آں رپوٹ بصدر نرسیدہ باشد
مستر استرلنگ رہرو راہ عدم گردیدہ باشد۔ چوں از ہمہ نگسلم، و بدامن جارج سوئنٹین
ماد ر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغل جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ!
معزول نگردد مگر کولبرک، بمرگ ناگاہ نمیرد مگر استرلنگ بولایت نرود مگر جارج سوئنٹین،
در خورِ ایں صدمہ ہاے جاں کاہ نباشد مگر اسد اللہ داد خواہ + + + + + + +

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط ۔۔ دلنواز نامہ پس از عمرے
رسید، و عمرے دیگر بخشید، تا عمرِ باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد۔ اما شاد کردنِ دلے
کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشند نہ آسانست۔ منم کہ چوں نامۂ شمار سیدے مستانہ جاے
برجستمے، و جہان جہان نشاط اندوختمے۔ اینک تا چشم بسوادِ ایں صحیفہ دوچار شد گیتی

در نظرم تیرہ و تار شد۔ نخست آنچہ بنظر در آمد خرد آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خوں کرد۔ یعنی از جہاں رفتنِ خواہرِ عزیز شما۔ ہے ہے! ایں مخدومۂ مرحومہ ہماں ست کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنودہ بودید دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپائے خاطر را فرو گرفتہ در نظر دارم کہ از مردنش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد۔ توانا ایزدِ پاک شما را شکیب عطا فرماید، و تنومندیِ دل و توفیقِ ثبات ارزانی دارد، و ایں سانحہ را در روزنامۂ عمرِ شما خاتمۂ مکارہ و مقطعِ مصائب گرداند۔

"آشکارا شد کہ مخدومِ مرا از علاقۂ تازہ خشنودی نیست۔ ہر آئینہ انکشافِ ایں معنی غبارِ ملال بر دل فرو ریخت۔ خدارا دلتنگ نتواں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت۔ شارستانے (معمورۂ) بدیں تازگی در گیتی کجاست۔ خاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرز و بومِ دیگر خوشتر۔ من و خدا کہ اگر متاہل نبودمے، و طوقِ ناموسِ عیال بگردن نداشتمے؛ دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے، و خود را دراں بقعہ رساندمے۔ تا زیستمے دراں مینوکدہ بودمے، و از رنج ہواہائے ناخوش آسودمے۔ زہے ہواہائے سرد، و خوشا آبہائے گوارا، فرخا بادہ ہائے ناب، و خرما ثمر ہائے پیش رس۔

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد   غالبؔ آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعۂ تاریخ لکھکر بھیجا ہے اور انھوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گذرا ہے تو اسکا شکریہ اور

ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے: "گمنامے را نامور
ساختن، و ہیچ را ہمہ پنداشتن، عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ، خاصہ کہ
آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روے نماید، وآں بزرگ مرحمت بے استدعاے
سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بیں دارد۔ بنگرد کہ واجب تعالیٰ شانہٗ اجزاے ممکنہ
را کہ در کتمِ عدم متواری بودہ اند محضِ عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ، و براں معدومات منت
نہادہ۔ حقا کہ اگر تاملے بسزا کردہ شود رقم گشتن قطعۂ تاریخ در آئینۂ سکندر ازیں عالم خبر
می دہد۔ وچوں ناخواستہ اینچنیں نوازش بمیاں آمد۔ ہر آئینہ روائیِ خواہش را چگونہ
چشم تواں داشت۔ لاجرم در گزارشِ مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو را سر انجام گفتگو
دادہ می شود۔

شنفتہ باد کہ قدر ناشناسی حکام زنگ آں ریخت کہ فاضلِ بے نظیر والمعیِ یگانہ مولوی
فضل حق از سر رشتہ داری عدالتِ دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار رہا نماند۔ حقا کہ
اگر از پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک وا ماند،
و باز آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز ایں عہدہ دونِ مرتبۂ وی خواہد بود
بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خاں (رئیسِ جھجھر) پانصد روپیہ ماہانہ براے مصارف
خدامِ مخدومی معین کردہ و نزد خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت ولیعہد خسرو
دہلی صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر مولانا را تا پدرود کند۔ سوے خود طلبید، و دو شالۂ ملبوسِ
خاص بدوشِ وے نہاد، وآب در دیدہ گردانید، و فرمود کہ ہرگاہ شما می گوئید کہ من

رخصت می شوم۔ مرا۔ جز اینکہ بپذیرم۔ گزیر نیست۔ آنا ایزد داناداند کہ لفظِ وداع از دل بزبان
نمی رسد الّا بصد جرِ ثقیل" تا اینجا سخن ولیعہد بہادرست۔ غالب ستہام از شما می خواہد
کہ واقعۂ تودیعِ مولوی فضلِ حق، و اندوہ ناکیِ ولیعہد بہادر، و بدرد آمدنِ دلہائے اہلِ شہر،
بعبارتے روشن و بیانے دلاویز در آئینۂ سکندر بقالبِ طبع درآرید؛ و مرا دریں تفقد
منت پذیر انگارید۔ والسّلام

مولوی سراج الدین احمد نے خط اِس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات
پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب نشان دیں جس سے اُنکے مفصل
حالات معلوم ہوں۔ نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لئے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور
خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"ہر نسیمے کہ زکوے تو بجانم گذرد ۔۔۔ یادم از و لولۂ عشرِ سکبار دہد"

رسیدنِ مہر افزا نامہ دل برد، و جاں بخشید۔ اگرچہ آں جاں با من نماند، وہم بر سرِ آں نامہ
بفشاندن رفت؛ لیکن سپاسِ دلربائی و جاں بخشی باقی ست۔ امید کہ تا جانِ بخشیدۂ
یزداں در تن ست گزاردہ آید۔

مخدومِ من در رسیدنِ نامۂ پیشیں دو دِل (مترددم) چراست؟ ہنوزم نشاطِ ورودِ
آں نمیقہ در دل، و سوادِ سطورِ آں صحیفہ در نظر جا دارد۔ چوں فرماں چناں بود (یعنی در نامۂ
پیشیں)، کہ غالبِ خویشتن نشناس سخنے از رسم و راہِ سترگانِ پارس برگوید، و کتابے
ازاں گروہ نشاں دہد کہ راز آں دریں کشش، و سازِ ایں باستانی زباں۔ اناں اوراق

[...]یافت با ابرم دانش من (علم من)، اندازهٔ سرانجام پاسخ آں نه تافت (تحمل نکرد) چوں چاره
[...] که خواہش چنین ست۔ ناچار مہر خموشی از دہاں و پردهٔ شرم نادانی از میاں برداشته میگویم که
روائی ایں خواہش از ہیچکس چشم نتواں داشت، و خود را بندِ ایں پژوہش و تلاش خسته نتواں کرد۔
نگارندهٔ دبستانِ مذاہب با ہمه لاف آشنا روئی (واقفیت) آنچه میگوید نه ہمه است و نه ہمه برجای خود ست
(یعنی نه مکمل ست و نه سراپا صحیح ست) پارسیانیکه در سورت و بمبئی آشیاں دارند۔ زینہار گماں نبری
که از آں گروه (یعنی از سترگانِ پارس) جز نام نشاں دارند۔ آں پویه و آں ہنجار (یعنی آں روش
و آں طریق) و آں نگارش و آں گفتار ندانند، و جز تخمه و نژاد از روے شیوه بپارسیاں
نمانند۔ پارسیاں از گرانمایگانِ روزگار، و برگزیدگانِ دادار بوده اند، و به روزگارِ فرمانروائی
خویش دانشہاے سودمند (علوم مفیده) و کنشہاے خرد پسند (اخلاقِ پسندیده) داشتند۔
گشایشِ رازِ خراہشِ ہفت سپہر، و نمایشِ اندازهٔ گردشِ ماه و مہر، پدید آوردنِ رخشنده گہرہا
از تهِ خاک، و بدر کشیدنِ بادهٔ ناب از رگِ تاک، پژوہشِ اسبابِ خستگی و رنجوری، و گزارشِ
احکامِ پزشکی (طبابت) و چاره گری، پرده کشائی فہرستِ اسرارِ کیائی (سلطنت) و فرماندہی،
و رصد بندی تقویمِ آثارِ بندگی و فرمانبری، عنوانِ بیک دگر بستنِ رنگ رنگ گہرہا، ہنجار
سره کردنِ گونه گوں ہنرہا، دارو گیاہا فراخورِ ہر درد بکار اندر آوردن، و پرندگانِ ہوا
و درندگانِ دشت را شکار اندر آوردن، بکوتاہی سخن۔ والائی اندازِ ہرگونه بینش، و پیدائی
اندازهٔ کمالِ آفرینش، ہمه در آئینهٔ اندیشهٔ ایں فرزانگاں رہ سے نموده۔ و انگیزشِ
بایستگیِ گفتار و کردار که اکنوں به اندکے ازاں بسیار نازند۔ از منشِ دانشِ ایں فرہنگیاں بوده است۔

گنجینهٔ خسروانِ پارس را از هر علم دفترے بود، و هر دفتر از گرانمایگی گنج گوهرے۔ چون
دولت از آن طائفه روے برتافت، و سکندر ابنِ فیلقوس بر ایران دست یافت، کتب خانهٔ
خسروی به تاراج رفت۔ امّا آنچه پراگنده بود و گمنامان بهر گوشه و کنار داشتند۔ بر جا ماند۔ تا بروزگارِ
پیروزیِ تازیاں دراں کشش و کوشش از هر جا گرد آمد (فراہم آمد) و بفرمانِ خلیفه۔ افروزینهٔ گلخن
گرمابهاے (حمامهاے) بغداد شد۔ همانا احکام آذر پرستی هم با آذر باز گشت۔ زبان آورانِ
عرب پارسی را به تازی آمیختند، و زبانے تازه برانگیختند۔ اکنوں کیست تا بداں زبانِ کهن
سخن درست تواند گفت، و ازاں دیریں آئیں براستی خبر تواند داد۔ پژوهندهٔ ایں راز را
کامِ دل بر نیاید؛ و من ضامن که هر چه پس از فراواں جستجو فراهم آرد۔ نه آنچناں باشد که
دل بداں تواں نهاد۔

دیگر آنچه کلکِ مشکبار بداں رفته که نتیجے از گفتارِ نارواے خود برنگارم، و لختے از ماجراے
خود برگزارم۔ اندیشه را به لب گزیدن و خرد را به شگفت زار (در محلِ تعجب) افگند۔

چگویم از دل و جانے که در سپاسِ من است — ستم رسیده یکے ناامیدوار یکے

آنچه بداں ارزم و مرا ایں پایه از کجا باشد که ستودگاں مرا ستایند، و گفتارِ مرا در تذکرهٔ
شعرا جا دهند۔ از فرجامِ فرهمندیِ هستی (یعنی از شان و شکوه هستی) و سر و برگِ پیدائی۔
که نزدِ آشکارا بیناں زود زوال، و بو الادیدِ یکتا گزیناں (یعنی قائلانِ وحدتِ وجود) نمودِ
بے بود ست۔ آنچه بمن داده اند زبانے ست یاوه سراے و خامه ایست بیهوده پوے۔
من هم از بے مایگی چوں کودکاں که درم از سفال سازند و به گنجینه داری نازند۔ سرودهٔ زباں

بیودۂ خامہ را (یعنی کلامِ خود را) پارہ پارہ بہم بستہ و ریزہ ریزہ یکجا کردہ، بگمانِ نام آوری
دل از تابِ اندوہِ ناروائی آں خوں ست۔ دیوانے ترتیب دادہ جابجا بنظرگاہِ التفاتِ
راں فرستادہ ام۔ بزرگانے کہ بہ پرسشِ غالب مستمند روے آرند۔ سوادِ ہر غزلے کہ
خواہند ازاں اوراق بردارند، کہ انتخاب و التقاطِ اشعار حوالہ بہ راے نامہ گرد آور (یعنی
مؤلفِ تذکرہ) است، نہ باشارۂ و ایماے سخنور + + + + + + آما اگر گزارشِ حالِ سخنور
ہوس ست، خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریدۂ آں فن از من سخن رانند۔ سخن را
در ستایشِ من بدیں گونہ بہ گرمی نشانند کہ از ناکسانِ روزگار و بیکسانِ دہلی دیار مسلمان زادہ
ایست کافر ماجرا، و گبریست مسلمان نما، کہ از غلط نمائی غالب تخلص میکند و بدیں نگ
تراز می نماید۔

خرسندی غالب ہنوز نہیمہ گفتن یک بار بفرماے کہ اے ہیچکسِ ما

پنہاں نماناد کہ در اصلِ آفرینش از دودۂ روز فروز فتگاں، و حلقہ بخت برگشتگاں ستم سیدہ
و روے بہی نا دیدہ کستم، آرایشِ سخن پیشکش (یعنی برطرف) ترک نژادم، و نسبِ من
با فراسیاب و پشنگ مے پیوندد۔ بزرگانِ من از انجا کہ با سلجوقیاں پیوندِ ہم گوہری داشتند
و بعہدِ دولتِ ایناں رایتِ سروری و سپہبدی افراشتند۔ بعد سپری شدنِ روزگارِ جہانداری
آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چوں ناروائی (کساد بازاری) و بینوائی روے آورد۔ جمعے را
ذوقِ رہزنی و غارتگری از جاے برد، و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت۔ نیاگانِ مرا
توراں زمیں۔ شہرِ سمرقند آرامگاہ شد۔ ازاں میانہ نیاے من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگِ ہند

کرد، و بلاہور، ہمراہی معین الملک گزید. چوں بساطِ دولتِ معین الملک در نوشتند -
بدہلی آمد، و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوست. زاں پس پدرم عبداللہ بیگ
خاں شاہجہان آباد بوجور آمد، و من بہ اکبرآباد. چوں پنج سال از عمرِ من گذشت - پدر از
سرم سایہ برگرفت. عمِ من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بناز پرورد - ناگاہ مرگش
فراز آمد. کما بیش پنج سال پس از گذشتنِ برادر پے ہمیں برادر برداشت، و مرا دریں
خرابہ جا تنہا گذاشت. و ایں حادثہ کہ مرا نشانۂ جاں گدازی و گردوں را کمینہ بازی بود
در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی ہنگامِ ہنگامۂ لشکر آرائی و کشور کشائی صمصام الدولہ
جرنیل لارڈ لیک بہادر بروے کار آمد. چوں عمِ مرحوم از دولتیان دولتِ اہلِ فرنگ، و با
انبوہی چار صد سوار برکاب صمصام الدولہ، با سرکشاں سرگرمِ جنگ بود، و ہم از بخشش ہاے
سرکارِ انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافاتِ اکبرآباد بہ جاگیر داشت - سپہ سالارِ سرکار
انگلشیہ بخوں بہاے آفتاب (یعنی نصر اللہ بیگ خاں) کلبۂ تارِ گدایاں را چراغ، و ما
بینوایاں را بعوضِ جاگیر مشاہرہ از خار خارِ جستجوے وجہ معاش فراغ بخشید تا امروز
کہ شمارۂ نفس شماری زندگانی بہ چہل و چار میرسد - بداں راتبہ خرسندم، و بداں مایہ قانع
در سخن از پرورشِ یافتگانِ مبداء فیاضم، و سوادِ معنی را بالفروغِ گوہرِ خویش روشن کردہ ام
از ہیچ آفریدہ حقِ آموزگاری بہ گردن، و بارِ منتِ رہنمائی بر دوش نیست -

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم — زاں رو بصفاے دمِ تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

...بپایاں رسید، و شرمِ پراگندہ گوئی دود از نفسی برمن اشتلم کرد. دیدہ وراں دانند
...قتی فراواں بود، و افسانہ پریشاں، تا کجا اندک گفتمے، و گفتار را از درازی نگاہداشتمے
...راہ در آنچہ رفت گناہے نیست. و اگر خود گناہ است، دوست کریم ست و کرم عذر خواہ. والسلام

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ راے چھجمل دہلوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتے
...یں ہیں ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے - لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ
طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اُسکی جبلّت میں ہے. اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "دو ایکہ
...فتی فلانی روش حکیمانہ دارد، و دنیا را کار آگاہانہ می گذارد - با ایں ہمہ اندوہناکی خندہ ام
در گرفت، و عنانِ ضبطِ خویش از کفم بدر رفت. ندانی کہ براسپانِ بادرفتار برنشستن، و
گروہا گروہ مردم را پیشاپیش دوانیدن، تن را بلباسِ رنگا رنگ برآراستن، و معدہ را
بہ الوانِ خوردنیہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیروں راندن، و غبارِ معصیت بزرق
افشاندن، از حکما نیاید، و نیز تنکاں را نشاید. کارِ دانشوراں چیست؟ دور از آبادی در بُن
کوہے نشستن، و از شش جہت در بروے خلایق بستن، تن را بریاضت فرسودن، و
...جاں را بہ تجرّدی پالودن. ہر کہ حکیمِ خرد گزین ست کار و بارش این ست. بے برگ و نوائے
از شکنجۂ گوناگوں حسرت بدر جستہ بہ فراخناے سرخوشی (مستی) رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ رَو
و بالطبع کریم بوَد. ہنوز اَدعیۂ منی از ریاحِ غلیظۂ صالحۂ کبدیہ ممتلی وارد، ہر آئینہ بفرمانِ باد
ست. روزے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسۂ زر زناں، و در حسرتِ زرِ تلف کردہ زاری
کناں. ایں کہ فلاں و بہماں را از نزدِ خویشتن راندہ است - حقّا کہ روے در مصلحتے

نداشت، و ہر چہ کرد از بیخردی و ابلہی کرد۔ چہ- اگر دانا بودے، و خرد داشتے- آناں را کہ رانده است نه راندے، و کار ہا از آناں گرفتے۔ و ایناں را کہ با خود و یک پیرہن جا داده است- چوں غبار از دامن افشاندے؛ و ہرگز بہواے ایناں نرفتے۔ کودکی و بیجا صلی ورزید، مگر و سرا ایام صاحبزادگی و ولیعہدی از آناں ولے پرداشت، و با ایناں لختے رام بودن از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن، و در دامِ ایناں بدیں کوری درآمدن- نہ بفرمانِ من نشستہ است نہ بفرمانِ بنیش، حکیم کرا میگوئی؟ و کرم پیشہ کرا میخوانی + + + + چوں سخن دریں باب بسیار ست نامہ بدعا ختم می کنم۔ دیده زانیشے درست و دل را دانشے سودمند روزی باد۔

مولوی محمد علی خاں صدر امینِ بانده جن سے مرزا باندے میں ملکر کلکتے روانہ ہوئے ہیں- کلکتے میں پہنچکر انکو سفر کی تمام روئداد لکھی ہے اسکے آخر میں لکھتے ہیں "در روز شنبہ چارمِ شعبان پارۂ از روز برآمده در کلکتہ رسید۔ غریب نوازیہاے وہابِ بے منت را نازم کہ درچنیں دیار خانۂ چنانکہ باید، و ہرگونہ آسایش را بکار آید؛ ہم اورا باندازۂ فراغ خاطرِ آزادگاں فضائے، و ہم اندرو مانندِ دہانِ آزِ دنیا طلباں بیت الخلائے؛ در گوشۂ صحن پر از آبِ شیریں چاہے، و بر طرفِ بام در خورِ اہلِ تنعم آرامگاہے- بے آنکہ جستجوئے رود، یا گفتگوئے شود بمنتِ ولے رحمت بکرایۂ ده روپیہ ماہانہ بہم رسید؛ و آدم و چارۂ وا را آکیہ گاہ آرامش گردید۔ و در روز از رنجِ راه آسوده منشور لامع النور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علیخاں) را شمعِ راه عصا ساختم، و در کشتی نشستہ آہنگِ ہگلی بندر کردم۔ بلطفِ ملاقاتِ نواب علی اکبر خاں طباطبائی اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد- رواست؛ و اگر گویم کہ مرا بر من برشک آورد نیز جا دارد۔ بخدا کہ

و فرید و فرد و مهر برگزیده - بدیں گرانمایگی و صاحبدلی در بنگاله دیگرے نخواہد بود۔ یارب ایں
مہر گرامی از کدام کان ست، و ایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامیں دودمان۔ بارے
بہ نخستیں صحبت بود۔ بچارہ جوئی و مصلحت پرسی درد سر ندادم، و دو سہ ساعت نشستہ بخمکدہ
باز آمدم۔ آوخ (افسوس) کہ دریں روزہا نواب را با حکام ہگلی در خصوص زمینے کہ وقفِ امام باڑہ
است معارضہ درپیش و دل سرگرمِ فکرِ کارِ خویش ست۔ و للہ در القائل۔

همه را ماتمی حسرت دنیا دیدم چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

روزگار فرمانبر و بخت فرماں پذیر باد۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں
اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں "از نوادرِ حالات اینکہ سخنوراں و نکتہ بیانِ
ایں بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزمِ سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی، روز یکشنبہ نخستیں
سخنگویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی و فارسی خواندندے۔
ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است دراں انجمن می رسد، و اشعارِ مرا
شنودہ بہ بانگ بلند می ستاید۔ و بر کلام نادرہ گویانِ ایں قلمرو تبسّم ہائے زیرلبی می فرماید۔ چوں
طبائع بالذات مفتونِ خودنمائی ست، ہمگناں حسد می برند، و کلانانِ انجمن و فرزانگانِ
فن بر دو بیتِ من اعتراض نادرست برآوردہ آں را شہرت می دہند۔ و بے آنکہ مرا
زباں بپاسخ آشنا شود - از دانشوراں - کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خاں و مکرمی و مطاعی
مولوی محمد محسن از آنانند - جوابہا می یابند، و پس زانوے خموشی مے نشینند۔ چنانچہ اہم

بہ فرمان ایں دو بزرگوار مثنوئے انشا کردہ ام، و بعد از اظہارِ عجز و انکسارِ خویش جوابہائے اعتراض دراں ابیات موزوں ساختہ، و آں مثنوی (یعنی مثنوی بادِ مخالف) پسندیدۂ طبعِ عالمے افتادہ است۔ انشاء اللہ العظیم زیں بعد عریضۂ کہ بہ والا خدمت خواہد رسید ورقے ازاں ابیات در نوردِ آں خواہد بود،،

نواب ضیاء الدین احمد خاں اکبر آباد گئے ہوئے ہیں مرزا انکو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دلّی سے اِس طرح لکھتے ہیں ،، جانِ برادر! اشک و آہِ غالبِ نامراد، یعنی آب و ہوائے اکبر آباد بہ شما سازگار باد۔ گر فہم کہ خود را بسفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) و نزدیک خود (یعنی بدانستِ خود) از من دُور تر رفتہ آید، امّا چوں ہنوزم در وطنید، ہمانا کہ نزدیک باشید۔ شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستاد، تا ہمدریں غربت (یعنی در دہلی) دادِ شادمانیِ دیدارِ وطن نیز توانم داد۔ زینہار اکبر آباد را بچشمِ کم (یعنی بچشمِ حقارت) ننگرند، و از رہگذرہائے آں دیار الحفیظ گوی، و الاماں سرائے، گذرند، کہ آں آباد چہ ویرانہ و آں ویرانہ آباد بازی گاہِ ہمچو من مجنونی، و ہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمۂ خونی ست۔ روزگارے بود کہ دراں سرزمیں جز مہر گیاہ (نام رستنی) نہ رُستے، و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیمِ صبح دراں گلکدہ (یعنی آگرہ) بہ مستانہ وزیدن دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے (یعنی بشورش آوردے) کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سر، و پارسایاں را نیتِ نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرۂ خاکِ آں گل زمیں را از تنِ پیارے بود دلنشیں، و ہر برگِ آں گلستاں را از جاں دُر دِے بود خاطر نشاں، امّا تازگیِ وقتِ شما را در نظر داشتہ در دو پردہ شور ریشِ انگیختہ نمود...

[illegible] باد ۔ جنت کسے و سینہ، دوسرے کہ ہیچ گاہ نتوانستند کہ زخمش نگین دینی است بنگیں
[illegible] اکبر آباد معروف است) دعائے مرا کدام ادا پذیرفت ؟ ودریا پاسخِ سلامِ من بزبانِ ممدوح
چہ گفت ؟

نواب عبداللہ خاں صدر الصدور میرٹھ برادر نواب محمد سعید خاں مرحوم رئیس رام پور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیس ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھو مگر اُس زمانے میں مرزا پر ضعف بہت ہی تھا اسلئے اُنکے جواب میں لکھتے ہیں "خدام بلند مقام کہ سرانجامِ قصیدہ از غالبِ بے نوا چشم داشتہ اند مگر آں فرسودہ روانِ افسردہ دل را - کہ ہنوز نمردہ است - زندہ پنداشتہ اند۔

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی | بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

کاش گشایشِ ایں کار چوں صنعتِ نقاشی وگلدستہ بندی تنہا بکوششِ دست و بازو صورت بستے، تا چشم از خستگیِ دل پوشیدے، و فرماں پذیرانہ در پردازشِ کار کوشیدے۔ چہ کنم چوں سرِ ایں رشتہ در دستِ دل ست - تا دل بر جائے نباشد زباں سخن سرائے نباشد۔ دیدہ ورانِ صاحبدل دانند کہ چہ قدر ما دیدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشے - بداں شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند - انگیختہ شود۔ ایں دلِ شکستہ بہم نہ پیوستہ - کہ در سینۂ من، وہمانا دشمنِ دیرینۂ من ست - زنہار بکارِ سخن گستری نیاید، ومعنی آفرینی را نشاید + + +

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اوّل ہی مرتبہ اصلاح کے لئے بھیجی ہیں اُسکے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں "خواہشِ حک و اصلاح مہر افزود۔ چنداں کہ دیدہ بداں سواد دوختم تا زنہار صورتے بنظر در نیامد، ہنجار ورَوِشِ خود از نیرو ہائے درونی ست۔ آرے

سے خامہ و زبان ہر کس خرامے دیگر دارد۔ آموزش را دریں پردہ راہ نیست واگر گویند
ہست، ہر آئینہ مے توانم گفت کہ نیست مگر بہمنشینی و ہمزبانی آموزگار، و بسر بُردنِ روزگار
در سَرہ کردنِ گفتار۔ چوں صحبت صورت ندارد، وگفتہ آمد کہ ہر چہ بہر نمط گفتہ اند نہ غلط گفتہ اند
می باید حلقہ بر درِ دل زَد، و ہمت از مبدأ فیاض دریوزہ کرد۔ بکثرتِ مشق، و فراوانی ورزش
و پیروی راہروانِ راہ داں، کشایش ہا روے خواہد نمود، و اندیشہ را دستگاہ و گفتار
را سرمایہ خواہد افزود،،

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ
جو حمد میں عرفی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اسکی
داد چاہی ہے وہ خط بجنسہ لکھا جاتا ہے ،، سبحان اللہ! باآنکہ از فرامُش گشتگانم، ودامن
کہ دوست مرا بہ دُو جَو بلکہ بہ نیم خَسُ برنگیرد۔ ہرگاہ بساز داوِن آہنگِ گلہ روے آرم، و سنجم
کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، واز قہرمانِ اندیشہ
دُور باشے (یعنی امتناعے) درمیاں نیست۔ ہر آئینہ۔ بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست
روے سخنے ہست۔ آنچناں برخویشتن مے بالم کہ غمِ جاں گدازِ فراموشی فراموش، ولب از
زمزمۂ کہ دل دربندِ سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد۔

ازخویشتن بذوقِ جفا با تو ساختیم   بادگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہوائے آں در سرافتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً لعُرفی گفتہ آید۔ چوں
کوششِ اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند، و نہ مرا جاے۔ ناگزیر آں ابیات را پرکشیدے

...ام کہ چوں من صد وچوں عرفی صد ہزار را بہ سخن پرورش تواند کرد، و پایۂ ہر یک ... تواند نمود۔ والسّلام

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجائے خود ایک دفترِ طویل الذیل ہے کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کرکے لکھی ہیں اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہو سکتے ہیں مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اس لئے ہم اسی قدرِ قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِس انتخاب کے بعد ہمکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے اُن مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اِس طرح کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی جائیں اُنکو ایک دوسرے کے محاذی لکھدیا جاے اور اس بات کا اندازہ کرنا۔ کہ کون سا بیان کس پایہ کا ہے اور کون سا کس درجے کا۔ ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں جن میں سب سے اول معرفت الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں اُنکو بادشاہی اور درویشی کا

جامع قرار دیا ہے اور شبلی ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم دونو کتابوں سے وہ مقامات مقابل یکدگر نقل کرتے ہیں۔

ظہوری

تا جداری لفظ و معنی بہ حشمت ثنای تارک آرائیست کہ سمی خلیل خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را مرادر اقلیم صنعت یہ نہ صفت یگانہ و ممتاز گردانیدہ اول معرفت کہ باوجود حجب کثرت در مشاہدہ شاہد وحدت معنی کاہم معجز نظام "لو کشف الغطاء" ما ازدیاد یقیناً " وصف حال او ساختہ، گلستان نیت و بوستان عقیدتش از خس و خاشاک شک و شبہہ پرداختہ مجموعہ عرفان موحدان فردے از دفتر شناسائیش، عنف و اشتلم ما سوے پسندیدہ طبع مدا سائیش۔ بہ توضیح بیانش فشانہائے بے نشاں (یعنی ذات بی نشاں) ہمہ دلنشیں و خاطر نشاں۔ بہ آفتاب جہاں گرد تاکید نظر بر دو بیناں نینداختن، و بہ مقتضای تہدید بہ احوال احولاں نپرداختن۔ زنار را

غالب

ازانجا کہ بعد ہر دو ر طورے دیگرست، و بس اند ہر انجام سرانجامے جداگانہ؛ در ہر عہد عہد اسمے دیگرست (یعنی اسمے دیگر از اسماے الٰہی) و در ہر وقت وقت کشائش طلسمے دیگر۔ فرۂ ایزدی (نشان الٰہی) کہ جمشید را بنام آوری شکوہ عز و غنا از سیاوخشیدے، و آنرا بہ نشانندی فقر و فنا فروغ بخشیدے۔ مظہرے کامل و مرآتے روشن خواست تا دراں مظہر ظہور ہر دو رنگ، و دراں مرآت رؤیت ہر دو صورت یکبارہ روے دہد۔ او رنگ و منبر یکے شد، و وسادہ و سجادہ را دوئی از میاں رفت۔ درفش کاویانی (کہ نشان پادشاہی ست) از عصا و ردا (کہ ہر دو شعار درویشان ہر دو درفش جمع آمدہ) ہستی پذیرفت کہ یکی من بہ پیوند این دو جزو باز بستہ است، و عصا و ردا درفش را سپاس گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش) نقش جمعیت ما

ظہوری

پیوندلیست کہ گیختنش برکت کشِ
قیشیاں (یعنی قسیساں) نہ خندد، وکفر را
با ایماں نہ سرسیت کہ صداعش صندل چارہ
از پیشانیِ برہمناں نبرد۔ از صدمۂ توحیدش
دوئی دریکی گریختہ، وبہ علاقۂ تجریدش خودی
در توی آویختہ۔ گوشے حق شنو، چشمے حق بیں،
دلے حق جو، خاطرے عرفاں زا، سینۂ
معرفت خیز، تارکے آسماں سا، جبینے
سجدہ ریز۔

مثنوی

پایۂ رفعت برآسماں دارد
سرِ خدمت برآستاں دارد
در عبادت بہ گفتن و دیدن
طرزِ او طرزِ حق پرستیدن
خلوت دیگران و صحبتِ او
وحدتِ این و آن و کثرتِ او

غالب

رسا نفسے است۔ یکدگر فہمیدنِ ایں دو قدح (یعنی
فقر و سلطنت) مجمع البحرینے پدید آورد، و سرہم آوردنِ
ایں دو قوس نقشِ دائرہ پدید کرد۔ از سرجوشِ فروغِ
مہر و ماہ، با فشردن و پالودن و سرشتن بیکدیگر ساختند،
و بہ فروغِ گزندِ چشمِ بد از پیوندِ برین براں پیکر سپند سوختند۔
سرش را بتاجِ شاہی افراختند، و دلش را بنورِ الٰہی افروختند۔
----- زہے در انجمن خلوت نشیں، و بپادشاہی کار آگہی
گزیں۔ پادشاہاں در انجمن ازاں کارآگاہ آداب آموختہ
و کارآگاہاں در خلوت ازاں پادشاہ فیض اندوختہ -----

مثنوی

اے کہ از رازِ شناں آگہ نہ
دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نہ
در ہزاراں مردم مردِ رہ یکے ست
آدمی بسیار اما شہ یکے ست
در تو مے پرسی کہ مردِ راہ کیست
جز سراج الدین بہادر شاہ کیست

ظهوری

در و لش این و آں نے گنجد
ہیچ جز حق دراں نے گنجد
بت شکن گشت چوں خلیل بخست
با دش ارزانی اعتقادِ درست
کفر در فکر نکتۂ عرفاں
شرک در شکر نعمتِ ایماں
طینتش باج خواہِ طینت ہا
نیتش پادشاہِ نیت ہا
در عبادت زہے تنومندی
بندگی در خور خداوندی
سِرِ وحدت بمغز بُرد از پوست
ہمہ اُو کرد خویش را ہمہ اوست

غالب

در طریقت بہ ہمنای رہرواں
در خلافت پیشوای خسرواں
آنکہ چوں از رازِ وحدت دم زند
دفترِ کون و مکاں برہم زند
آنکہ چوں در نئے نوارا سر دہد
نے شود نخلے کہ شبلی بر دہد
شبلی از منبر دہد آوازِ عشق
شاہِ ما بر تخت گوید رازِ عشق
عشق دارد پایۂ ہر کس نگاہ
منبر از شبلی و تخت از پادشاہ
آنچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعدِ ترکِ مسندِ جم یافتست
شاہِ ما دارد بہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاجِ خسروی
شاہ و درویشی اینجا باہم ست
پادشہ ہم قطبِ عالم ست

[شیخ علی] حزیں اور مرزا کے طرزِ بیان کا مقابلہ

[حزیں] نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اسمیں وہ فخریہ فقرے جو اُسنے اپنے دیوان اور اپنے [کلا]م کی شان میں لکھے ہیں اُسی قسم کے فقرے مرزا نے بھی دیوانِ فارسی کے دیباچے میں [ل]کھے گئے ہیں. سو دونو دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کرکے اس مقام پر [م]قابل یکدگر لکھتے ہیں.

حزیں	غالب
ہمایوں خطہ ایست لباب از جواہرِ کلم، و جواہرِ حِکَم، روح پرور ہوایش ربیعی اعتدال، و جداولِ سطورش از ماءِ معیں مالامال. خاکش مشکیں نفس و شمیمش عنبرآگیں، آبش خمار شکن و نسیمش مسیح آئیں. از صبوحیِ فیضے کہ ساقیِ کلکش پیمودہ۔ سیاہ مستانِ حروف سر در کنارِ ہم غنودہ اند، و از نشۂ ہوش پردازے کہ دستِ فکرت در جام و سبوے الفاظش ریختہ، سرمستانِ معنی نشئہ شوق سرودہ.	بنام ایزد بخشش نقابیست از روی شاہدِ ہر حرف کردہ معنی بجنبشِ نسیم بر افتادہ، یعنی کشاکشِ دستِ ناکشیدہ. باز بیں چراغیست از گرمیِ چراغانِ نیم سوختہ پہلوئے رخ بہ افروختن دادہ، یعنی داغ منتِ خس نادیدہ. کہن داغہائے جنون ست سراسر بناخنِ شوخیِ نفس خراشیدہ. گرما گرم خونابہ در روشست بہ تفِ پہنائیِ دل ناگہ از ناسور تراویدہ. کاغذی† پیرہنانند (یعنی دادخواہانند)
بنام ایزد حسنِ لیلیٰ ست کہ از طرفِ خیامِ الفاظ سر بر زدہ در جلوہ گری ست، یا شورِ مجنونے ست کہ از نوادیِ تفسیدۂ دل برخاستہ در پردہ دویست.	† الفاظ کو اس لئے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں کاغذی پیرہن کہا ہے اور کاغذی پیرہن دادخواہ کو کہتے ہیں دوسرے فقرے میں معانی کو اسلئے کہ انکی روحیں حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے مست بیکف اور سیہ پوش کہا ہے.

حزیں

ستانے ست از گل پیرہناں در موج ،
ستانے ست سیمیں بدناں فوج در فوج ۔
ں پیکر انند در خیابانِ سطور دوشادوش ،
ں شیوہ دلبر انند از بادۂ ناز گرم نوشانوش ۔
ں بنانند حباب پرورد ، گل پیرہنانند
گرد ۔ پختہ مغز انند برشتہ پوست ،
ہ نغز انند آشنا دوست ۔ صوفیانند در
رت خانۂ عشق مستِ سماع ، سوختگانند
ند آسامستِ وَداع ۔ درویشانند
رِ کیش ، فروکیشانند از ہمہ در پیش ۔
یر صولتانند از جوشِ خط پلنگینہ پوشش ،
یا دلانند از شورشِ عشق در جوش و
روش ۔ آئینہ پیکر انند آئینہ تاب ،
یزہ گوہر انند یکسر خوشاب ۔ گلبرگہائے
بنم زدۂ بہاری ست ، خراشیدہ نالہائے
بلِ شاخساریست ۔

غالب

چوں پیکرِ تصویر از حیرتِ واقعہ خاموش (یعنی
اپنی بے قدری سے حیران ہیں) مشعل کفِ گزرگانند
(یعنی فریادیانند) چوں آذر از دودِ دل سیہ پوش ۔۔۔
نگویم دود و چراغ ست یا لالہ و داغ ؛ اما سوختگی را
سرگذشت ست و خستگی را رویداد ۔ نگویم تجلی و طور ست
یا جنت و حور ، اما نازش را قلمرو ست و آرائش
را سواد (نواح) طلسمِ شعلہ و دود ست بازبستۂ زردشت
خیال ؛ شعلہ پنہاں ، و دود پیدا ، دل لوحِ طلسم ،
و زباں طلسم کشا ۔ ہنگامۂ ابر و باد ست ز گنجینۂ جادوی فکر ،
ابر گہرپاش ، و باد الماس فشاں ، اندیشہ طومار نیرنگ ،
و لب افسوں خواں ۔ دود کبابیست باند از پیچ و تابے کہ از
شعلہ در دل افتادہ است ۔ بر ہوا آتش بستۂ خیلِ غزالست
بساماں خیشبے (سراپردہ) کہ در کمیں گاہ رو داوہ است ، از
دام بدر جستہ ۔ جمالیست در پردۂ نمایشِ خویش شاطر
حقیقی را ستایش نگار ، نہالے ست در سایۂ برومندی
خویش نخلبندِ ازل را سپاس گزار ۔

مرزا اور ابو الفضل کی طرز بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں جو شیخ کے اکبرنامہ میں مذکور ہیں، مگر چونکہ مرزا نے اُن واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے اس لئے دونوں کتابوں کی طرز بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادہ واقعہ دونوں کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

اکبرنامہ

ترک بزرگترینِ فرزندانِ یافث بود ترکاں اورا یافثِ اوغلاں گویند و ہوشیار دلی وکارگزاری و رعیت پروری از ہمہ برادراں امتیاز داشت۔ بعد از رحلتِ پدر بر تختِ فرمانروائی نشست، و دادِ مردمی و مردانگی و مظلوم پرستی داد۔ و در جائے کہ ترکاں اورا سیلول باسلیکائی میگفتند، و چشمہ ہاے آبِ سرد خوشگوار و گرم عافیت بخش و مرغزار ہاے دلکش داشت۔ اقامت فرمودہ۔ از چوب

مہرِ نیمروز

ترک ابنِ یافث نشانِ جہانداری یافت و ترکاں ایں والا شکوہ را۔ ازاں رو کہ بہ ترکی شہریارِ جواں را اوغلاں گویند۔ یافثِ اوغلاں گفتند۔ داد و دانش آئیں داشت، و دریں ہر دو شیوہ روشہاے گزیں داشت۔ خانی و مرزبانی را فرہنگ ہا پدید آورد، و فرماندہی و فرمانبری را اندازہ بر نہاد۔ نزہتگاہِ سیلول باسلیقا را۔ کہ چشمہ ہاے رواں و گل و میوہ فرواں داشت۔ از بہرِ آرامش گزید از نے و علف و چوب و گیاہ نشیمن ہا افراختے، و پوست دام و دد را پوشش تن ساختے۔ گویند نمک بروزگارِ وے پدید آمد؛ ورنہ ازاں پیش ترّہ و گوشت ہمچناں بے نمک ہمی خوردند۔ ترکان شمشیر زن را بفرمانِ فرزانہ شیر افگن (یعنی یافثِ اوغلاں)

اکبرنامه

گیاه خانه‌ها اختراع کرد، و خرگاه
پدید آورد. و از پوستِ بهائم و سباع
لباسِ پوشیدنی دوخت. و نمک در
زمانِ او ظاهر شد. و در آئینِ او آں
بود که پسر را جز شمشیرے میراث ندهند،
و تمام خواسته دختر را باشد. و گویند که
او معاصرِ کیومرث اوّلِ ملوکِ عجم ست،
و او اوّلِ سلاطینِ ترکستان ست.
و عمر او دویست و چهل سال بود.
النجه خاں بهترینِ فرزندانِ ترکی
بود. چوں پیمانهٔ زندگیِ ترکی پر شدن
گرفت، او را بمشورتِ بزرگاں بر
تختِ سلطنت نشاندند. او خرد
و دوربیں را پیشواے خود ساخت
و در عدالت گستری روزگار گذرانید.
چوں پیر شد عزلت اختیار نمود.

مهرِ نیمروز

برنهاد دستورها و قرارداد آں بود که از آں همه برگ و ساز که از مردهٔ
مرور میراث ماند جز شمشیر به پسر ندهند و همه بدختر باز گذارند
که هر آئینه تیغِ جوهردار فردِ فهرستِ گنجینهٔ سیم و زر بلکه کلیدِ فتحِ
هفت کشور ست. اگر بدیں یارکِ الماس گوں دسترس
ست مرد را دست مایهٔ ناز بس ست. بالجمله ایں همه رسم و
آئیں نهاد و پایانِ کار پس از دویست و چهل ساله بیداری
بخوابِ عدم سر بر زمیں نهاد. بزرگانِ دوده پس از یافتِ
او غلاں به فرزندِ بختِ بلندش النجه خاں چشم روشنی
گفتند. گل کج نهاد و راستی پیشه گزید. بدی پیرامونِ دلش
نگذشتے، و بابداں همزباں نگشتے. آزاده رو بود و دل بیادِ یزداں
در گرو داشت. تاج و تیغ و نگیں در زندگانیِ خویش، به نوبادهٔ
باغِ کامرانیِ خویش دیباقی خاں جوان بخت نوجوان سپرد، و
خود از ایں خاکداں دامن برچید و بآفرینِ خانه که تو آں را صومعه
گوئی آرمید. دو صد و پنج سال پارهٔ نمودارِ اقبال و پایهٔ بسیاری
ذوالجلال در جهانِ گذراں ماند، و بهنگامِ ناگزیر در گذشت.
دیباقی خاں که هم در نظرگاهِ پدر او رنگ آرای بود سزوکِ خسروی

اکبرنامه

و یاپنچی بعد از عزلت پدر
و اشارتِ عالیش فرماں روا
شد. کیوک خاں فرزندِ رشید
اوست. پدرش در هنگام بدرود
کردنِ جهاں سریرِ خانی بآو عنایت
فرمود. او قدرِ سلطنت را دانسته
در لوازمِ آں اهتمام بجاے آورد
النجه خاں پسرِ اوست در
آخرِ عمرِ پدر ولیعهد شد. دادِ
داد و دهش را از اندازه بیروں
برد. و ترکاں در زمانِ دولتِ او
مستِ دولت شده از راهِ خردمندی
عدول نمودند. و چوں مدتے
براں بگذشت اورا دو پسر
بیک شکم آمد. یکے را مغل
نام کرد و دیگرے را تاتار. و چوں

مهر نیمروز

را به نمطے تازه آراست، اما پداں دانشوری و دادگری
که جز دانش نه جُست و جز داد نه کرد. روزنامهٔ عمرش چهل
رقم یک صد و هشتاد و شش سالگی پذیرفت در نوشتند،
و بارنامهٔ کلکلی و گردنکشی بنامِ پسرِ فرخ اخترش کیوک خاں
نوشتند. ستوده ستایش درخورِ کار آگاهی آبروی پادشاهی
افزود. و یک صد و چهل سال از مرگ اماں یافت. فرزانه
تا از شاهی نشاں یافت جهاں را بخوشی و خشنودی جهانیاں
بهره‌ور از رنج نگاهداشت. سرانجامِ کارِ جهان و جهانیاں را
بفرزندِ خویش النجه خاں گذاشت. به تردستی دریاکف، و
به بیدریغ بخشی ابرِ کردار بود. دهش را برداد بیشی داد. و فرودستار
(زیردستاں) را به دهش از خواهش بے نیاز ساخت. سبکسراں با
بروت (یعنی به کبر و غرور) از جا رفتند. و از دائرهٔ کیش
آئیں بدر زدند. آرامشداد (یعنی انتظام) کنار گرفت
و بت پرستی صورت پذیرفت. بانوی ایں فرمانروا
بابرگ و نوا دو پسرِ توام نژاد. اورنگ نشیں (یعنی النجه خاں)
یکے را مغل خاں و دیگرے را تاتار خاں نام نهاد

اکبرنامه

ند کاروانی رسیدند ملک خود را
به دو حصه بخش کرد یک نصف را به
مغل داد و نصفِ دیگر را بتاتار
و چون پدر بزرگوارِ ایشاں ودیعتِ
حیات سپرد. فرزنداں با یکدگر
موافقت نموده هرکدام در ولایتِ
خویش خود آرائی می کردند.

مهر نیمروز

هر دو را بناز پرورد. چون به برنائی رسید قلمرو خویش
را دو نیم کرده نیمه بمغل و نیمه بتاتار نامزد کرد و خود کلید
و بست و هفت سال در گیتی درنگ ورزیده سپئے
رفتگاں برداشت الله الله ایں را نیز چوں رونہ
فرو رفتگانِ دگر روز فرو رفت ؎

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
هم خزاں هم بهار در گذرست

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور اُنکے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اُسکا دکھانا مقصود تھا۔ ختم ہوگیا، مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُن تصنیفات میں شمار نہیں ہوسکتی جنکی آجکل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے؛ اور جو اہلِ وطن کی موسمی بیماریوں کے لئے براہِ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ اِس مضمون کے لکھنے پر ہمکو اُس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے جسکی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن میرسد از دل بہ لبِ ما ۔۔۔ عشق ست کہ بربستہ زبانِ ادبِ ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا جاتا ہے اُسکو چاہو اُس معتقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کردیتا ہے، اور چاہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے؛ بہرتقدیر یہی وہ چیز تھی جسنے ہمکو اِس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہمکو یہ دعویٰ ہے کہ ہمنے اِس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے؛ اور نہ یہ خیال ہے کہ محض مُلک کی خیرخواہی اُسکے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض

طبیعت کے اقتضا سے نہ کہ عقل کی صوابدید سے سرانجام کیا جائے اُس سے لوگون کو بواسطہ یا بلا واسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہونچے ؛ ہوا جو اپنی موج مین چلتی ہے، اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے۔ گو انکو خود خبر نہین کہ ہم کہاں جارہے ہیں اور کیوں جارہے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اُنکی سعی محض بے حاصل اور اُنکی کوشش سراسر بے سود ہے۔ اِسی طرح کوئی ذرہ ذراتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظامِ کُلّی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

"اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو، روی نیست — در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ ہر سبیا"

یادگارِ غالب کو ہمنے دو حصوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مرزا کی لائف یعنی اُنکی زندگی کے حالات اور اُنکے اخلاق و عادات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں اُنکے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں۔ جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں۔ کوئی مہتم بالشان واقعہ اُنکی شاعری و انشاپردازی کے سوا نہیں پایا جاتا ؛ باانیہمہ اُسمیں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہلِ وطن کے لئے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ اُنکی ننھیال۔ جہاں اُنھوں نے پرورش اور نشو و نما پائی۔ آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھگئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری ہوئی تھی جسکے بھڑکانے کے لئے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا

[illegible] میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفہ الحالی، نانا نانی کی نازبرداریاں
[illegible] مرزا کا ذکی الحس ہونا؛ یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوانِ شباب میں انکا جادۂ مستقیم
سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال
کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہولی نشے ہرن نہوئے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں
سنبھلے مگر وہ جو مشہور ہے کہ "صبح کا بھولا شام کو آجائے تو بھولا نہ جانو" اُنھوں نے
اپنے فضل و کمال، حسنِ معاشرت، شریفانہ خصائل، اور کریمانہ اخلاق سے۔ جو کہ
اُنکے ذاتی جوہر تھے۔ وہ عارضی دھبے اِس طرح دھوڈالے کہ گویا کبھی اُن سے دامن آلودہ
نہوا تھا جس فن پر اُنھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا اُسکو اخیر عمر تک نبھا دیا؛
غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اُسکا خیال نہ چھوڑا؛ اور باوجودیکہ زمانہ قدر دانوں سے
خالی تھا اُسکو اُس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اُسکا منتہاے کمال تھا۔

اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ اور ہمت کے
موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی؛ بلکہ جن اُلٹے تللّوں میں بچپن اور جوانی گذری
تھی اُسکے لحاظ سے یہ کہنا چاہئے کہ وہ اخیر دم تک خورِ بعد الکور میں مبتلا رہے۔ اِسکے سوا
امراضِ جسمانی سے کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کسادبازاری کا رنج ہمیشہ سوہانِ روح
رہا۔ باوجود اِسکے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک اُنکی رفیقِ حال رہی۔ اگرچہ
نظم و نثر میں جو زارنالیاں اُنھوں نے کی ہیں وہ بظاہر بے صبری اور تنگ حوصلگی
پر۔ جو ایک اخلاقی کمزوری ہے۔ دلالت کرتی ہیں؛ لیکن درحقیقت یہ اُنکی شاعری و

انشا پردازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا جسکی زمین اُنکے پانو کو لگ گئی تھی. اول تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزوِ اعظم ہے؛ دوسرے ہر شاعر ایک خاص راگنی کا کلانوت ہوتا ہے. چنانچہ عرب کے شعرا میں امرء القیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا، اعشےٰ حسنِ طلب اور وصفِ شراب میں ضرب المثل تھا اور اسی طرح ہر شاعر کی شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی. علیٰ ہذا القیاس ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا، نظامی بزم کا، اور سعدی موعظت کا. چونکہ مرزا خاصکر رنج و مصیبت کے بیان میں ید طُولےٰ رکھتے تھے اس لئے یہ مضمون اکثر اُن کے قلم سے تراوش کرتا تھا.

اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ- اس وجہ سے کہ زمانہ اُسکا اندازہ کرنے سے عاجز تھا- پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیئے تھا نہیں بٹھا سکے؛ مگر وسعتِ اخلاق حسنِ معاشرت اور صلح کل سے اُنھوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا. قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے دوستوں اور ہوا خواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہونچ گئی تھی؛ اور ہر ایک کے ساتھ اُنکے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں اُنکے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا. غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھکر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو عسرت کے وقت اپنے سے علحدہ نہ کرنا، درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور اُنکی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور اُنکے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاسِ وضع اور خودداری کو ہاتھ سے

مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب وملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں
تپاک اور خلوص سے ملنا، یہ اور اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دار الخلافہ کی قدیم
سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں انکی ذات میں جمع تھیں. خصوصاً وفاداری وحق شناسی
اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کے قدیم خاندانوں کا شعار تھا مرزا
کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی. چونکہ انکے چچا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک
کی مہمات میں شریک رہے تھے اور انکی وفات کے بعد گورنمنٹ نے انکے پسماندوں
کے لئے - جنمیں سے ایک مرزا بھی تھے - کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کر دیا تھا
مرزا نے - جیسا کہ انکی تحریرات سے ظاہر ہے - اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو
فراموش نہیں کیا. تمام عمر ملکۂ معظمہ اور وائسراؤں اور لفٹننٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور
افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی، بعض افسروں کی وفات پر
دردناک مرثیے لکھے اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگانِ دامنِ دولتِ انگلشیہ
سے سمجھتے رہے. غدر کے زمانے میں فوجِ باغی کے ظلم وستم سے جو اثر انکے دل پر
ہوا تھا وہ انکی کتاب دستنبو سے - جو غدر کے حالات پر اُسی شورش وفتنہ کے زمانے
میں انھوں نے لکھی تھی - ظاہر ہے. سنہ ۱۲۵۱ھ میں ولیم فریزر صاحب رزیڈنٹ وکمشنر
دہلی کے بے گناہ مارے جانے پر جو سخت صدمہ انکو پہنچا تھا وہ انکے اُس خط سے جو
شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہوتے ہی انھوں نے لکھا تھا - ظاہر ہے. وہ اس
خط میں لکھتے ہیں "یکے از ستمگرانِ ناخدا ترس - کہ بعذابِ ابدی گرفتار باد - ولیم فریزر را

کہ رزیڈنٹ دہلی و غالبِ مغلوب را مُربّی بود، در شبِ تاریک بضربِ تفنگ کُ
غمِ مرگِ پدر تازہ کرد۔ دل از جاے رفت، و سترگِ اندوہے سراپاے اندیشہ
خزینِ آرمیدگی پاک بسوخت، و نقشِ امید از صفحۂ ضمیر سراسر ستردہ شد،،

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصنافِ سخن سے زیادہ م
ہوتی ہے اور اُنھوں نے جا بجا اِس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ
اہلِ جاہ کی مدح میں صرف ہوا، مگر ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا
اختیار کیا تھا اُسکی تکمیل اُنکے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اِس خاص صنف
یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی؛ کیونکہ فارسی شاعری کی ابتدا اِسی صنف
سے ہوئی اور کوئی شاعر جسنے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا
گیا۔ یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی، اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اِس آلودگی
سے پاک نہیں رہا۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اُسکو شعرا میں شمار کرنا
نہیں چاہیے اور اِسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا
جانتے تھے۔ بڑی دلیل اِس بات کی کہ زمانے جس قدر قصیدے اہلِ دنیا کی مدح
میں انشا کیے ہیں اُن سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی۔ یہ ہے کہ اُنکا ممدوح مخاطب
صحیح ہو یا نہو، اور اُس سے حسنِ کلام کی داد ملنے کی توقع ہو یا نہو۔ وہ ہمیشہ قصیدہ
کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا
کمالِ شاعری اُسی طرح ظاہر کرتے تھے جیسے متنبی سیف الدولہ کی یا عرفی خانخانا

نہیں کرتا تھا۔ مع ذلک چند قصیدوں کے سوا۔ جو دوستوں کی ترغیب و
یے انھوں نے کسی امید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیسوں کی مدح
ہیں۔ باقی اُنکے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں، یا اپنے معزز
ض ہمعصروں کی تعریف میں، اور یا اُن لوگوں کی شان میں جنکو وہ اپنا مُربّی
ولی نعمت سمجھتے تھے اور جنکی مدح سرائی کا فرض بطور شکرگزاری و منعم پرستی زبانِ
و انعام ادا کرتے تھے، جیسے قلعۂ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد، یا ملکۂ معظمہ اور والیسرائے
ور ہند اور دیگر اعیان وارکان سلطنت انگلشیہ، یا فرمانروایانِ ریاستِ رام پور
ر الور وغیرہ۔

با اینہمہ جس مؤثر طریقے سے مرزا نے اہلِ دنیا کی مدح سرائی پر افسوس کیا ہے
وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ دیوانِ فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے
متعلق بہت سے فخریہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں "درہوائے کہ بالِ بالا خوانی
زدہ، و درادائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اس قدر
فخر کیا ہے) نیمۂ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل سرائی ہے)
و نیمۂ دیگر تونگر ستائی ست۔ یعنی باد خوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے) بیداد بیں!
کہ ہر جا بہ شانہ۔ خمے از زلفِ مرغول مویاں کشودہ شود بلا در من آویزد تا دل بیچاک
آں شکن بندمے؛ و خواری نگر! کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغ بہ اورنگِ سروری
بہ فشیند ہوس مرا برانگیزد تا بہ پیش بندہ دارا ست استمے۔ شادم از آزادی کہ با سخن بہ نجار

عشقبازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدحِ
سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمر سبک سیر لختے بہ چامہ و چنگ سرآمد، و پارہ بدروغ ود

یہاں تک جو کچھ کہ مرزا کی لائف کے متعلق ہمکو لکھنا تھا لکھا گیا۔ اب ہم چند
اُنکے کلام کے انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں۔

ہمنے اس کتاب میں۔ جیسا کہ مکرر بیان ہو چکا ہے۔ مرزا کے کلام کا انتخاب ﴿؟﴾
اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری و انشاپردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا
فطرت میں رکھی گئی تھی۔ جہاں تک کہ اُنکی نظم و نثر اُس پر شہادت دے سکتی ہے۔
صاحبانِ ذوقِ سلیم پر واضح و لائح ہو جائے۔ اگرچہ فی الحقیقۃ طریقۂ مذکور سے اس غرض
کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے لیکن اگر بالفرض اُسکا پورا ہونا تسلیم کر لیا جائے تو بھی
بظاہر اُس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔

زمانۂ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اسیطرح
لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقے کی شاعری (اگرچہ ابھی تک اُسکا
نعم البدل پیدا نہیں ہوا) روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے۔ نظم و نثر میں بجائے
صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان
زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جو باتیں پہلے محاسنِ کلام میں داخل تھیں اب اُنمیں سے
اکثر داخلِ عیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ
باقی ہے اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا مگر زمانے کا رُخ قدیم شاہراہ سے

ہے! اور آیندہ تمام قافلوں کو جو اِس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں
کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر
کر لیا جائے تو بھی اِس زمانے میں اُنکی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے
کرنے اور اُنکے مبلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا بظاہر ایک ایسا کام معلوم
ہے جسکا وقت گذر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے
قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً ہندوستان کی
لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے ایسی یورپ کے
موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یوروپ کے بعض نامور مشرقی
شاعروں کے کلام سے ابتک استفادہ حاصل کرتے اور اُس سے صدہا اسلوب
بیان اخذ کرتے ہیں تو ہمارے ہموطن کیونکر اُس سے استغنا کا دعوے کرسکتے ہیں۔
جس طرح زمانۂ حال کے انجنیر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجنیرنگ کے
متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں اسی طرح اِس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم
لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کرسکتے ہیں۔ ہمنے مانا کہ انگلش لٹریچر کی
ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اُسی کی بدولت کچھ عرصے
سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہمکو انگلش لٹریچر سے
کون سی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہئے
اُسوقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہیگا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہمنے اِس کتاب میں دکھلایا ہے
کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق کے موافق نہو لیکن اِس سے مرزا کے
کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا۔ جو اپنے زمانے میں
تھے۔ آج اہلِ زبان اُنکی طرزِ شاعری کو نام رکھتے ہیں؛ خصوصاً متوسطین
میں جو لوگ جامی کے بعد ہوئے ہیں اور جنہیں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ہیں
صفویہ اور مغلیہ کے عہدِ حکومت میں ایران یا ہندوستان میں عَلَمِ اُستادی
شاعری کو۔ جیساکہ رضا قلی خانِ ہدایت نے اپنے تذکرہ مجمع الفصحا میں
کے ساتھ لکھا ہے۔ آج اہلِ زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ سب قدما کی
ہیں کے تتبع کا دم بھرتے ہیں۔ حالانکہ متوسطین ہما اُس
ے ہیں جنکے کمال اور اُستادی کا انکار نہیں ہوسکتا عرفی وغیرہ
انشا پردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ہو جو عالمگیر
شاکر جو سب سے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی اُس سے
ع کے سانچے میں نہیں سماسکتی۔ تھے۔ اگرچہ حافظ
مرزا کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے محدود دائرہ سے قدم باہر نکالا
ہی چند میدان جن میں اُنھوں نے گھوڑے دوڑائے تھے ہمیشہ مرزا
لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری اُنکی طبعیت میں پیدا کیا گیا تھا اُس
جاتا ہے کہ جس طرح دریائے مواج جدھر رخ کرتا ہے اُدھر ایک راستہ

دان میں قدم رکھتے اُسکو کامیابی کے ساتھ طے کرجاتے۔ وہی
ری ہین مجنوں کا جی لُبھاتی ہے جب اُسکو دوسری طرح کام میں لایا جاتا
بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرکاہ کی طرح اڑا دیتی ہے۔ اور وہی ایک چیز
یں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں
ا میں حبِ وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگا دی۔

ورقدیم کا ملکہ شاعری کسی خاص زمانہ یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت
کھتا ہیں یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں
ویسی متاخرین میں نہیں ہوسکتی، یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے
شاعروں کے شعرا میں نہیں ہوتی۔ ملکہ شاعری کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسی
بیان لیاقت یا سُریلی آواز، جس طرح ان دونو صفتوں کا ہر زمانے اور ہر ملک
جس اعلیٰ درجے پر پایا جانا ممکن ہے اسی طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا
متعلق ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف
لشریک ظہور کرتا ہے، اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص
پر ڈال دیتا ہے وہ سوسایٹی کا دباؤ اور اُسکا مذاق ہے۔ انھیں اسی ملکہ شاعری
ت جو اُسکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں
ا، اور اسی سوسائٹی میں نشو و نما پاتا جسمیں فردوسی نے نشو و نما پائی تھی تو
... کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ پاتا جو فردوسی کو

بہ نسبت اہلِ زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے، اور ایک دیہاتی کم
کی اعلیٰ قابلیت سے سا[illegible] بہ جدت [illegible] لیاقت
بہ نسبت خواص اہلِ شہر کے
اگر ہندوستان کی اس سوسائٹی کے سائے میں بھی مثلاً ایک
اگرچہ [illegible] بھی تو یقیناً وہ شاعری میں وہی صنف اختیار کرتا جو انیس نے [illegible] محدود
اور اس میں انیس سے کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا۔ اسی بنا پر ایران کا عرفی جیسا
شاعر کہتا ہے۔ ہیں تو دو ایک بھی دیکھی

نیست اندر زمانہ محمودے ورنہ ہر گوشہ [illegible] شمار ہو سکتا ہے

اور اسی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں۔ ہے اس بات کے

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

مرزا نے جس وقت شعرِ فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اس
ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا، ایک نظیری و عرفی وغیرہ کی طرز
طرز جو اکبر کے زمانے سے چلی آتی تھی؛ دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر
میں شایع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آکر ختم ہو گئی۔ جو لوگ شعر فارسی میں کمال
پہنچانا چاہتے تھے وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔ اگرچہ حافظ
[illegible]رو کی غزل ان سے بہت زیادہ مقبول خاص و عام تھی مگر ان وجوہات
متاخرین کو طرزِ جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جن کا ذکر ہم دوسرے
[illegible]یں کر چکے ہیں۔ مرزا نے اول بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا، پھر [illegible]
[illegible]سے۔ کہ اہلِ زبان اس طرز کو ٹکسال باہر خیال کرتے تھے۔ تھا

بت اہلِ زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے، اور ایک دیہاتی کو
نسبت خواص اہل شہر کے بمراتب افضل و اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت
درجہ بظاہر اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسمیں بھی مثلاً ایک
ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاصکر اُس حصۂ زبان میں جو فارسی کی محد
شاعری میں مستعمل ہے اہلِ ایران کی برابری کرسکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عربی
کی نسبت۔ جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی
غیر عربی) فصحاے عرب کے کلام کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے"
پس فارسی زبان جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اس بات کے
زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحاے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہلِ زبان
میں شمار کیا جائے۔

مذکورہ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا
کو ملکۂ شاعری کے لحاظ سے اکبری دورے کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں یا اُن سے
کم سمجھیں یا اُنکے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت سو اُسکی نسبت پہلے حصے میں بیان
کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص
اور کثرتِ مطالعہ اور غواصیِ فکر اور مشقِ سخن اور خاصکر اپنی خداداد لٹریری قابلیت سے
یقیناً وہ مرتبہ حاصل کرلیا تھا جس سے ایک زبان دان مثل اہلِ زبان کے مستند سمجھا جا سکتا
لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ

وجدان کے سوا کوئی چیز اسکا فیصلہ نہیں کرسکتی - یہاں دو اور سوال پیدا
ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک زباندان آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا
ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشرووں کے ساتھ مساوات کا درجہ
حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے - دنیا
میں ابتدا سے آج تک نہ صرف شعر و شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشہ میں
ہمیشہ پیرو اپنے پیش روؤں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ اُن سے فائق اور افضل
ہوتے رہے ہیں۔ فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے؛
مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بقدم
چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے
بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو - جو یقیناً اُسکے پیش رو تھے -
غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے جو
اُن سے پہلے ہوئے - بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری
میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف اُن کا ہم پلہ قرار دیا جائے تو اس میں
کیا ہی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے
ایک امیجنیشن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال
پر قدرت۔ انہیں سے پہلی لیاقت - جیسا کہ ظاہر ہے - ممکن ہے کہ ایک زباندان

میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے شک اُنکا ایسا سمجھ
لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ یورپ کی شاعری درحقیقت یہ
اُسکا میدان اُسی قدر وسیع ہے جس قدر نیچر کی فضا۔ اُسکے فرائض مادری سے
دوسری زبان میں جیسے کہ چاہئیں۔ ادا نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ایشیائی شاعر جو اس
شاعری سے نابلد ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اُسکی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں
ہو سکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاصکر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں محض
معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں نئے نئے اسلوبوں اور نئی
نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا ہی کمالِ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک
بہت بڑا کمال ہے لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے
جسکو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور بشرطیکہ اُسمیں شاعری کی اعلیٰ قابلیت
ہو اُسکو شعراے اہلِ زبان کی طرح بلکہ بعض صورتوں میں اُن سے بہتر استعمال
کر سکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے، کیونکہ
مثنوی میں نظیری محض صفر ہے؛ اُسنے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بیشک
مثنویاں لکھی ہیں، مگر صاحبِ آتشکدہ نے اُن میں سے صرف ایک کی نسبت لکھا ہے کہ
"...بد نگفتہ است" اور باقی کی نسبت اُسکا یہ قول ہے کہ "بسیار بد گفتہ" حکیم ہمام کا بیٹا
حکیم حاذق عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے۔

چنداں سے کے سوز گداخت نداشت   کانِ نمک بود و ملاحت نداشت

نہیں؛ اول ری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے
نہیں قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا۔ بخلاف مرزا کے کہ اُسکو مثنوی پر بھی تقریباً
سی قدر قدرت ہے جیسی قصیدے اور غزل پر۔ نثر میں نظیری و عرفی دونو نے
کچھ یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا ہے
مگر اُس میں اول سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی یعنی ابراہیم عادل شاہ کی مدح و
ستایش کے سوا دوسرے مضمون کا نام نہیں جس سے لکھنے والے کی قدرتِ بیان
معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرزِ بیان اور طرزِ عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطع نظر
کی جائے تو بھی اُسکے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُسکو مدحیہ نثر
لکھنی اچھی آتی تھی۔ بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرزِ خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے
اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا؛ خصوصاً فخر و خودستائی، غم و
اندوہ اور شکایت و زارنالی کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانکپن کے ساتھ
مرزا نے نثر میں بیاں کئے ہیں اُسکی نظیر نہ صرف ہندوستانیوں کی نثر میں بلکہ متاخرین
اہلِ ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے
میں لکھ رہے ہیں کہ گو ہر شخص آزادی سے اپنی راے ظاہر کر سکتا ہے۔ لیکن فارسی
زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہوگئی ہے؛ اور اس لئے لوگوں سے
اپنے دعوے کے ثبوت میں اسکے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دیکھو، پڑھو، سمجھو

اور جا پخو.

الغرض مرزا کی فارسی نظم ونثر کے متعلق ہماری راے کا ماحصر
مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری۔
مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا، اور نثر میں تم..
سے بالاتر ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں؛ اور نثر میں
اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں جو۔ ممکن ہے کہ اہلِ زبان کے نزدیک فصاحت
کے درجے سے گرے ہوے ہوں؛ مگر ایسی کسروں سے کسی زباندان یا
کا کلام پاک نہیں ہو سکتا؛ اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسی کی اُستادی پر
آسکتا ہے و للہ دَرُّ القائل۔

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست　　　در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

مرزا کے اُردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصّے میں بقدرِ ضرورت بحث کر
ہیں۔ مرزا کا موازنہ شعراے اُردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہوسکتا ہے؛
اس کے سوا دیگر اصناف میں اُنکا کلام کَاَنْ لَمْ یَکُنْ ہے؛ اور اُردو کی نثر پر .. شعر
لہ مرزا کے صفِ محض ہیں۔ مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر و سودا کی ر
۔ تقلید کی قید سے آزاد ہیں۔ اُنکے چیدہ ور گ.

...ق اُسکو پسند کیا ہے۔ اُنھوں نے اُردو خط کتابت میں ایک خاص طرز...
...ے جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی بساط کے
...اُنکی پیروی کی ہے۔

...ن تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا
...ری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی - امیر خسرو اور فیضی
...ے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا؛ اور چونکہ زمانے کا رخ بدلا ہوا ہے
...سلیے آیندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے
...لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوں گے۔

غلط نامہ یادگارِ غالب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲	۱۱	خدا	آگے خدا	۱۱۹	۱۵	اعتراف	ا سر
۲۴	۱۰	شاہ	شاد	۱۴۲	حاشیہ ۱۹	خرچ	چرخ
۳۱	۸	رہتے تھے	رہے تھے	۱۸۵	۲	اللہ	اللہ بس
۳۳	۱۰	زہانید	زبانید	۱۹۳	۵	نیرنگی	بیرنگی
۴۸	۱۱	بارہ برس	باون برس	۱۹۵	۸	ڈھکیل	دھکیل
۵۱	۴	مُفہم	مفہَم	۲۱۰	۳	استوارہیا	استوار ہیا
۵۵	۲	باہلِ راو	باہلِ راز	۲۳۰	۱۰	تیرا خیال	میرا خدا
۶۷	۴	آنھوں	آنھوں نے	۲۴۲	۱۷	خادِ رہت	[illegible]
"	۱۴	آدمی	آگے کا آدمی	۲۶۱	۱۴		
		[illegible]	عَلت	۲۶۸			

ق اسکو پسند کیا۔

جو تمام ملک ۴۴۰

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۸۰	۳	زود	زود
۳۸۲	۱۲	امروزیے	امروزے
۳۹۱	۷	خورسند	خُرسند
۴۰۳	۴	پرَوَرَد	پروَرَد
۴۱۰	۱۶	نیمروز	مہرِ نیمروز
۴۱۱	۵	مرادر	دہر
۴۲۹	۱۱	ہوتا	ہونا

سطر	غلط	صحیح
	...ن تَ	میزان میں
	خانہ	شانہ
۱۲	رختِ	رختِ خواب
۳	ازہم دوختنِ دل و دست	ازہم دوختنِ دل و دست
۳	قلم	قلم
۵	ورق	وَرَق
۱۶	قرارد	قرارداد

نے دعوے ... ہیں اسے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دیکھو، پڑھو